اسلامیہ مشن پاکستان کی پیشکش

الصلح خیر

آہِ مومن

مصنفہ

ضیغم پاکستان، مفسر قرآن، سلطان الواعظین، قاضی شریعت

حضرت علامہ میرزا یوسف حسین صاحب قبلہ لکھنوی

مبلغ اسلام مدظلہ العالی

دارالاشاعت

دفتر اسلامیہ مشن پاکستان یوسفی منزل میانوالی

وقت کی پکار؟

برادرانِ اسلام! السلام علیکم

اگرچہ ادارہ "اسلامیہ مشن" کے قیام کو بتیس سال کا عرصہ گذر چکا ہے اور
اپنے زرّیں دورِ ماضی میں اس ادارہ نے متعدد رسائل شائع کر کے قوم کی اہم
خدمات انجام دی ہیں۔ لیکن تقسیم ملک کے بعد خونی انقلابات اور نامساعد حالات
کی بنا پر مشن کی سرگرمیاں مدّھم پڑ گئی تھیں۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ حضرت سرپرست مدظلہ کی انتھک کوششوں اور
قدیم ہمدردانِ قوم کے پرخلوص تعاون سے "مشن" کے دورِ جدید میں "عقائدِ مذہبِ شیعہ"
"وفاتِ عائشہ" طبع دوم اور "جوابِ شکوہ" پیش کیئے جا چکے ہیں اور اب یہ رسالہ
"اسلام اور امن" حاضر کیا جا رہا ہے۔

قوم کے مخیّر اور باہمّت افراد سے پُرزور اپیل کی جاتی ہے کہ "اسلامیہ مشن پاکستان"
کی دوامی رکنیت قبول فرما کر اس مشن کو بیش از بیش خدمات انجام دینے کا موقع
مرحمت کریں گے اور تبلیغِ اسلام میں عملاً امداد فرما کر سعادتِ دارین حاصل کریں گے

خادمِ ملت

(ڈاکٹر) میرزا احسنؑ رضا زاہد یوسفی (ہومیوپیتھ)
آنریری جنرل سیکرٹری:۔ اسلامیہ مشن پاکستان

۲۱ مارچ ۱۹۵۹ء

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا

اَلصُّلْحُ خَیْرٌ

اسلام اور امن

مُصَنَّفہ

حضرت فخر الواعظین جناب یوسف الملۃ مولانا مرزا یوسف حسین صاحب مدظلہ

صدر الافاضل مبلغ مدرسۃ الواعظین لکھنؤ

دفتر اسلامیہ مشن پاکستان یوسفی منزل میانوالی

قیمت ۱۲/-

وجہ تالیف

سنہ ۴۳ء کا واقعہ ہے۔ جب مشرق و مغرب میں جنگ عظیم شباب پر تھی۔ ش
جھانسی کے ایک مشہور پنڈت ڈاکٹر آتری صاحب نے جو ایک نہایت نیکدل او
روادار اور خوش اخلاق تھے۔ شہر جھانسی میں ایک تاریخی کانفرنس تجویز کی۔ ج
سے ان کا مقصد یہ تھا۔ کہ اس دار و گیر کے دور میں دنیا کے ہر مذہب و ملت کے
پیشوا اپنے اپنے مذہب کی تعلیمات سے یہ ثابت کریں۔ کہ ان کے مذہب نے دنیا
قیام امن کی کیا تعلیم دی ہے۔ اس کیلئے انہوں نے عیسائی۔ سناتن دھرم۔ آریہ
سکھ۔ کبیر پنتھی۔ بدھ مت۔ قادیانی۔ سنی۔ شیعہ غرض ہر مذہب کے مذہبی رہنماؤں
اداروں کو شرکت کی دعوت دی۔ منجملہ ان کے ایک دعوت مدرسۃ الواعظین لکھ
کو وصول ہوئی۔ ادارہ نے مجھے پنجاب میں مطلع کیا۔ کہ میں اس کانفرنس میں
شرکت کروں۔

وہاں پہنچ کر معلوم ہوا۔ کہ جلسہ نہایت اہتمام سے کیا گیا ہے۔ انتظامات بہت مکمل ہیں
اسٹیج بہت وسیع اور بلند ہر مذہب و ملت کے چیدہ افراد ہزاروں کی تعداد میں شریک
ہو رہے ہیں۔ آنے والے مقررین میں عیسائی۔ سکھ۔ کبیر پنتھی۔ سناتن دھرم اور قادیانی
حضرات کے کئی کئی مقررین تقریریں کر رہے ہیں۔ ایک عیسائی پادری کی تقریر سنسکرت
میں اور دوسرے کی اردو میں۔ ایک قادیانی مبلّغ کی تقریر سنسکرت میں اور دوسرے
کی اردو میں ہوئی۔ میرے پہنچنے سے قبل صرف قادیانی حضرات مبلغین اسلام کے
نمائندے بن کر مرزا صاحب کے اقوال کے جوڑ بند لگا رہے تھے۔ اور مسلمان اپنا کوئی
نمائندہ نہ ہونے کی وجہ سے بہت مضطرب اور کبیدہ خاطر تھے۔

اجلاس تین روز کیلئے مقرر تھا۔ اور رات کو ہوتا تھا۔ مَیں دوسرے روز پہنچ کر شریک جلسہ ہو سکا۔ اور تیسرے دن تقریر کا موقعہ ملا۔ جس میں مَیں نے قیام امن کے بارہ معیاروں کی فہرست قرآن مجید سے سنائی جس میں سے اس دن دو تین معیاروں پر روشنی ڈال سکا۔ جسے حاضرین جلسہ نے بیحد پسند کیا۔ اختتام جلسہ پر ان کے اصرار سے چوتھے دن ایک جلسہ کا اور اضافہ کیا گیا۔ اور چوتھے جلسہ میں مَیں نے چند معیاروں کی تفصیل پیش کی۔ اختتام جلسہ کے ساتھ ساتھ اہل ہنود اور مسلمانوں نے مزید تقاریر پر اصرار کیا۔ چنانچہ مَیں نے شہر میں دو تقریریں مسلمانوں کی دعوت پر اور ایک تقریر اہل ہنود کی دعوت پر ان کے مندر کے کھلے صحن میں اسی موضوع پر کی۔ پھر بھی شہر کے ہندو مسلمان مزید تقاریر کیلئے مصر تھے۔ مگر آواز گرفتہ ہو جانے کی وجہ سے اس قابل نہ رہا۔ اور معذرت کر کے روانہ ہو گیا۔ جناب ڈاکٹر آتری صاحب نے جس عقیدت اور محبت کا ثبوت دیا۔ اس کا اب تک دل پہ اثر ہے۔ چنانچہ اس کے بعد ہی موصوف نے جنرل سکرٹری مدرسۃ الوعظین کے نام شکریہ کا خط روانہ کیا جو درج ذیل ہے۔

مکرمی سیکرٹری صاحب مدرسۃ الواعظین

سلام مسنون!

کانفرنس خدا کے فضل سے بخیریت ختم ہو گئی۔ مَیں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ کہ آپ کے مدرسہ کا شکریہ ادا کروں۔ کہ آپ نے مولانا مرزا یوسف حسین صاحب کو بھیج کر کانفرنس کی کامیابی میں بڑا حصہ لیا۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ اسلام کی عالمگیر تعلیم کی تصویر مرزا صاحب نے جو کھینچی ہے۔ یہ انہیں کا حق تھا۔ حاضرین و سامعین جلسہ نے نہایت پسند فرمائی اور بہت متاثر ہوئے۔ یہاں پر کئی وعظ آپ کے اور ہوئے۔ ہندو اور مسلم کی فرمائشیں آپ کے وعظ کے لئے برابر چلی آ رہی تھیں۔ مگر وہ تیسرے روز بعد اختتام کانفرنس تشریف لے گئے۔ سامعین کی رائے ہے۔ کہ سب سے موثر تقریر

آپ کی ہوئی۔ خدا آپ کے اراکین مدرسہ کو جزائے خیر دے۔ اور جو اسلام کی تبلیغ
کا کام آپ کی جماعت صرف کثیر سے کر رہی ہے۔ بہترین مثال خلق خدا کی خدمت
بے غرض وایثار کی قائم کی ہے۔ جس کے لئے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں
آپ کے اراکین و معاونین کو آخرت میں بہشت دے۔ امید ہے کہ آئندہ سال
بھی آپ میری امداد فرمائیں گے۔ میں نے یہ مذہبی کانفرنس کے صرفہ کا سب بار
بذات خاص اٹھایا۔ کسی سے مالی امداد نہیں چاہی۔ اس پر بھی آریہ سماجیوں کی
طرف سے سخت مخالفت رہی۔ خدا کا شکر ہے۔ کہ خیریت رہی۔ ورنہ انہوں نے
کوئی دقیقہ فساد برپا کرنے میں باقی نہیں رکھا۔ افسوس حق مہمانی میں مرزا صاحب
کا ادا نہ کر سکا۔ کانفرنس کے زیر انتظام صرف ایک روز میرے غریب خانہ پر
تشریف فرما رہے۔ بعد کو معلوم ہونے پر دیگر اصحاب اہل شیعہ افراد کے ساتھ
اپنے یہاں لے گئے۔ اور امید ہے کہ حتی الوسع تکلیف نہ ہونے دی ہوگی۔

والسّلام آپ کا صادق

آنتری

اس کے بعد مدرسۃ الواعظین کے اصرار پر میں نے ان تقاریر کا خلاصہ مرتب کیا جس
کا ایک حصہ رسالہ "الواعظ" کی چند قسطوں میں طبع بھی ہوا تھا۔ مگر مکمل نہ ہو سکا۔ لیکن
چونکہ اس موضوع پر اس قسم کے رسالہ کی آج بھی اسی طرح ضرورت ہے بلکہ رہیگی
اس لئے حسب فرمائش ارکان ادارۂ اسلامیہ مشن پاکستان اس پر نظر ثانی کر کے برائے
اشاعت ان کے سپرد کیا ہے۔ میری دُعا ہے کہ خداوند عالم اس مختصر کو بہت سوں
کی ہدایت کا ذریعہ قرار دے۔ اور ناظرین کرام سے استدعا ہے کہ ناچیز کو
دعائے خیر سے یاد فرمائیں۔ والسّلام

احقر مرزا یوسف حسین عفی عنہٗ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؀

الحمد للّٰہ علی جزیل نوالہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ خیر خلقہ محمدٍ و اصفیاء آلہٖ ؀

امن اور صلح اتفاق و اتحاد یہ دونو انسانیت کے وہ فطری حق ہیں جن سے کسی صاحب فراست اور دور اندیش انسان کو اختلاف نہیں ہو سکتا. قتل و غارت فساد و خونریزی وہ انسانیت کش اور روح فرسا عادتیں ہیں۔ جن سے کوئی ایسا انسان نہیں۔ جسے فطری طور پر اختلاف اور نفرت نہ ہو. انسان تو پھر انسان ہے۔ حیوانات کے بہت سے انواع کو بھی اس کا پورا احساس ہے. مگر چونکہ وہ عقل و درایت سے محروم ہیں۔ اس لئے صرف اپنی نوع میں امن و اتحاد قائم رکھ سکتے ہیں۔ اور جس قدر ان میں آپس میں اتحاد ہے۔ اسی قدر دوسرے انواع و اصناف سے جنگ ہے۔ مگر انسان چونکہ اشرف المخلوقات اور عقل سلیم کا حامل پیدا کیا گیا ہے. اس لئے اسے اتنی قوت دی گئی ہے کہ اگر چاہے تو تمام جہان سے صلح اور سارے عالم میں امن قائم کر سکتا ہے۔

اگرچہ ایک مدت دراز سے عوام الناس امن شکنی اور خود پسندی کے اسقدر خوگر ہو گئے تھے۔ کہ وہ اپنے فطری اور آبائی حقوق (امن اور صلح) کو خیرباد کہہ چکے تھے۔ مگر ارباب بصیرت اور صاحبان ہوش ہمیشہ اس تلاش میں رہے. کہ اپنی زندگی کے اس پہلو کو مضبوط اور مستحکم بنائیں. جو صلح اور امن کے دامن سے وابستہ اور جھگڑے اور فساد سے کوسوں دور ہو۔

لیکن دور ماضی میں نفاق اور اختلاف کی اڑتی ہوئی چنگاریوں اور جنگ و جدل کے بھڑکتے ہوئے شعلوں نے جب بنی نوع انسان کی جان و مال اور عزت و آبرو اور غیرت وحمیت اور انسانیت و شرافت ہر شے کو تباہ و برباد کر دینے کا بیڑا اٹھالیا. تو اب وہی انسان جو کل تک تمدکار گاہ عالم میں بدامنی اور اختلاف کے نت نئے تماشے دیکھ کر مزے لے رہے تھے. اور شراب غفلت سے مست ہو کر محو خواب تھے. آج وہ بھی گہری نیند سے چونک اٹھے اور انہیں بھی یہ فکر ہوئی. کہ کسی طرح وہ صحیح راستہ تلاش کریں. جہاں امن و سکون اور صلح واشتی کی زندگی بسر کرنے کی امید ہو.

اس لئے کہ آج توحید پرست ہوں یا تثلیث پرست خدا پرست ہوں یا خود پرست با مذہب ہوں یا لا مذہب. فسطائی ہوں یا نصرانی. رومن کیتھلک ہوں یا بدھ مت یا دوسرے مذاہب ایسا کوئی نہیں. جس کا دامن خونریزی اور حق کشی. فساد اور ظلم کے داغ سے صاف ہو.

اگرچہ آج سے پہلے مختلف جماعتوں یا حکومتوں یا ڈکٹیٹروں نے صلح اور امن کا نام لے لیکر مختلف اصول اور قوانین بنائے تھے. کسی نے شخصی حکومت کو صلح اور امن کیلئے مفید سمجھا. اور اُسے نسلاً بعد نسل ایک ہی گھرانے کی میراث بنا دیا. کسی نے خاندانی لحاظ کے ساتھ ساتھ ظاہری اہلیت اور قابلیت کو بھی ضروری سمجھا. کسی نے حکومت کی مہار ایک مخصوص جماعت (پارلیمنٹ) کے ہاتھ میں دیدی. پھر کسی نے پارلیمنٹ کے ارکان کا انتخاب عوام الناس کی رائے پر موقوف رکھا. اور کسی نے شان و شوکت. دولت و اقتدار یا طمع اور لالچ یا خوف اور ڈر یا دوسرے اثرات کی بناء پر ارکان کا انتخاب کر لیا. کسی نے ترک مذہب کو ملکی ترقی کے لئے ضروری سمجھ لیا. کسی نے موجودہ زمانہ کی چلتی ہوئی ہوا یعنی

فیشن پر عزت و آبرو غیرت و عقل سب کو قربان کر دیا۔ کسی نے نزاکت و آرام پسندی اور تعیش کو حکومت کا جزوِ اعظم بنا دیا۔ یہ سب کچھ ہوا اور ہوتا رہا۔ مگر ان سب کا نتیجہ یہ ہوا۔ جو آج دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔ نزاکت اور عیش پرستی نے مردانہ ہمت اور جذبات کو فنا کر دیا۔ سائنس کی ترقیاں عذاب الٰہی بن کر سروں پر منڈلاتی رہیں۔ جدید مصنوعات بم بن کر موسلا دھار بارش کی طرح برس برس کر زمینِ حیات میں آگ لگاتے رہے۔ نہ بر میں امن نصیب ہو سکتا تھا۔ نہ بحر میں نہ زمین محفوظ رہی نہ فضاء۔ کرہ ارض کا مشرق و مغرب اور جنوب و شمال چاروں کنارے آئینہ کی طرح سامنے تھے۔ ہر آئینہ میں اپنی تصویر خونی نظر آتی تھی آخر خدا کو بھول جانے والے بھی خدا کو پکارتے لگے جو لوگ اپنے ملک سے خدا کو باہر نکال چکے تھے۔ وہ بھی پھر بلانے کی کوششیں کرنے لگے۔ جو معابد غیر آباد ہو چکے تھے پھر آباد ہونے لگے مسجدوں میں دعاؤں کی ضرورت پڑنے لگی۔ سچ ہے۔ آسائش و آرام کے وقت اپنی حقیقت بھول جاتی ہے۔ لیکن مصیبت کے وقت فطرت ہی کی طرف رجوع کرنا پڑتی ہے۔ اس لئے کہ مشکلات کی عقدہ کشائی اس کے ہاتھ میں ہے۔

نہ کسی کو یہ دیکھ کر رحم آیا کہ ان کا حریف بھی اسی طرح فیشن کا دلدادہ ہے۔ جیسے وُہ نہ کسی کو یہ خیال آیا کہ ان کا دشمن بھی اسی وضع کا کوٹ پتلون پہنے ہے جس وضع اور طرح کا کوٹ پتلون اُن کے زیب تن ہے۔ نہ کسی کو یہ لالچ ہوا کہ ان کا دشمن بھی اسی ملک کا باشندہ ہے۔ جس ملک و اقلیم کے وہ باشندے ہیں نہ یہ خیال آیا کہ ان کی زبان ان کی صورت ان کی معاشرت اُن کا طرز حکومت اُن کے عادات و اخلاق بہت کچھ آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ بلکہ کچھ ہی دور جا کر خاندان بھی مل جاتے ہیں۔ ایک ہی مذہب کا آدمی اپنے ہی اہل مذہب کو قتل کر کے فخر کر رہا تھا۔ ایک قوم کا سپاہی اپنی ہی قوم کو ذبح کر کے نازاں تھا۔ پھر بیدردی

کا یہ عالم تھا کہ نہ عورتوں پر رحم آتا تھا۔ نہ بچوں پر نہ بیوائیں قابل ہمدردی تھیں
نہ یتیم بچے نہ معذوروں کی کوئی شنوائی تھی۔ اور نہ بیماروں کی فریاد رسی۔

معلوم ہوا۔ کہ اہل دنیا نے صلح اور امن کے جسقدر اصول بنائے تھے۔ وہ
سب ناکارہ تھے۔ ورنہ ان کے اس قدر زہریلے اثرات رونما نہ ہوتے۔ اس کا
سبب صرف یہ ہے۔ کہ ان اصول کے بنانے والوں نے یہ اصول خلوص اور
نیک نیتی سے نہیں بنائے تھے۔ اور نہ ان میں انسانوں کا مفاد مدنظر تھا۔ بلکہ ہر
مقنن کے ذاتی اغراض اس میں شامل تھے۔ جیساکہ ہر مقنن کا اصل مقصد کچھ ہی
عرصہ کے بعد ظاہر ہو گیا اور آج بھی وہی قانون بنیاد فساد ہیں۔ جمہوریت کا دم
بھرنے والے آج اپنی شخصیت کی پرستش کرا رہے ہیں۔ عوام کا کلمہ پڑھنے والے
آج اپنی ڈکٹیٹری کا ڈنکہ بجوا رہے ہیں۔ اور انسانیت کی اتنی بھی قیمت نہیں
سمجھتے۔ جتنی کہ ایک مچھر کی قیمت ہوتی ہے۔ بھلا اس ذہنیت کے انسان دنیا میں
کیا صلح اور امن قائم کر سکتے ہیں۔

اس مختصر تمہید سے اس قدر ثابت ہو گیا۔ کہ دنیا کے فسادات اور خونریزیوں کا
سبب لامذہبیت ہے یا ترک پابندی احکام مذہب لہذا آج اگر کوئی طاقت دنیا
میں امن اور صلح قائم کر سکتی ہے۔ تو وہ مذہب اور صرف مذہب ہے۔ وقتی طور پر
سہی اور محدود قوم یا محدود ملک کے لئے سہی مگر اس میں شک نہیں۔ کہ وہ مذاہب
جو دنیا میں نیک نیتی سے قائم ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے اپنے عہد اور اپنے اپنے ملک
میں یہ کوشش ضرور کی۔ کہ دنیا کو مفید تعلیم اور مفید مشورہ دیا جائے۔ اور بنی آدم کو
حتی الامکان فائدہ پہنچایا جائے۔ اور نقصانات سے بچایا جائے۔ انہوں نے
حتی المقدور یہ کوشش بھی ضرور کی۔ کہ دنیا فساد اور خونریزی سے محفوظ ہو جائے
اور ملک میں امن اور صلح کا دور دورہ ہو جائے۔ مگر چونکہ وہ سب کے سب

محدود تھے۔ اور محدود ملکوں محدود قوموں اور محدود زمانہ کیلئے تھے۔ اس لئے انکے تعلیمات اپنے اپنے زمانوں میں مفید ہوئے۔ لیکن نہ ان کا نفاذ دائمی تھا نہ وہ تمام عالم کیلئے تھے۔ اور نہ آج سارا عالم اُن سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اسکے علاوہ ممکن ہے۔ کہ نفاذ کے وقت ان میں اعتدال کا لحاظ رکھا گیا ہو۔ مگر زمانہ کے حالات اور خیالات کے تغیرات کتب کے تغیّر و تبدّل وغیرہ کی وجہ سے آج وہ اصول اعتدال کی شکل میں نہیں ملتے۔ یا ایسے قانون ملتے ہیں۔ جن میں جنگ ہی جنگ کا ذکر ہے۔ اور یا اس قدر امن اور صلح اور سکون کی ہدایت کی گئی ہے کہ اگر صرف اُن کی پابندی کی جائے تو انسان کی بقاء اور ارتقاء دونو محال ہوجائیں۔ اور آتش فساد بھڑکنے کے بعد اس کے بجھانے اور دبانے کا بھی کوئی امکان نہ رہے حد یہ ہے۔ کہ شاید فصّاد کو فصد لینے جراح کو زہرباد شدہ عضو کاٹنے کا بھی حق نہ رہے۔ اس لئے کہ دونوں حالتوں میں خون بہانا لازمی ہے۔

یہ طے شدہ بات ہے۔ کہ آج دنیا میں صلح اور امن کا دعویٰ کرلینا تو آسان ہے لیکن اس کا ضامن ہوسکنا بہت دشوار ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب تک کوئی مذہب خود عالمگیر نہ ہو۔ وہ عالمگیر صلح اور امن کیونکر قائم کرسکتا ہے۔

اس کے بعد مجھے یہ کہنے کا حق ہے۔ کہ اگر اسلام عالمگیر مذہب ہے۔ اگر قرآن مجید عالمگیر کتاب ہے۔ اگر رسول اسلام عالمگیر رسولؐ ہیں اگر اسلام کی تعلیم تمام عالم کیلئے ہے۔ تو پھر اسلام کو تمام عالم میں صلح اور امن کا ذمہ دار ہونا چاہئے اس سے میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ آج دنیا کے اختلافات کیونکر دور کئے جائیں۔ یا آج جنگ کی آگ کو کیونکر خاموش کیا جائے۔ اور خونخوار نگاہوں کو کاسۂ رحم کیونکر پلایا جائے۔ بلکہ میرا یہ مطلب ہے۔ کہ ایک عالمگیر مذہب کے پاس ایسے اصول ہونا چاہئیں۔ کہ اگر دنیا اس مذہب کو اختیار کرلے یا اس کے قوانین

کی حلقہ بگوش ہو جائے۔ تو کبھی بدامنی اور اختلافات پیدا ہونے کا امکان ہی نہ رہے۔ اور اگر کوئی بدنما صورت پیدا ہو جائے۔ تو وہی اصول پھر اُسے نیست و نابود کر سکیں۔

بالفاظ دیگر وہ ایسے اصول ہوں۔ کہ اگر اہل اسلام اُن کے پابند ہو جائیں تو کبھی بدامنی یا اختلاف نہ ہو سکے۔ اور اگر بدامنی یا اختلاف پیدا کریں تو صحیح معنوں میں مسلمان کہے جانے کے اہل نہ رہیں۔ اور اگر غیر مسلم اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے مسلمانوں سے صلح کر لیں اور اصول صلح کے پابند رہیں۔ تو پھر مسلمانوں کو اپنا سرفروش بھائی سمجھیں۔ اور ہمیشہ کے لئے اپنے جان و مال عزت و ملک کی حفاظت کی فکر سے آزاد ہو جائیں۔

اس لئے کہ لفظ اسلام جو سلم سے ہے۔ اس کے معنی صلح ہیں۔ لہٰذا اگر مسلمان صلح کرے۔ یا وہ کام کرے جس کا نتیجہ امن اور صلح بن کر ظاہر ہو۔ تو وہ مسلمان ہے اگر ایسا نہ ہو تو وہ مسلمان نہیں ہے۔ صحیح بخاری میں جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث موجود ہے۔ کہ "المسلم من سلم المسلمون من یدہٖ ولسانہٖ" مسلمان وہ ہے۔ جس کی زبان اور ہاتھ کی ضرب سے مسلمان محفوظ رہیں۔ لہٰذا جس نے چند مسلمانوں یا ایک ہی مسلمان کو بلاقصور اذیت پہنچائی ہو۔ یا اب پہنچائے وہ لاکھ اسلام کا دعویٰ کرے۔ مگر مسلمان نہیں ہے۔ اور اگر ایک غیر مسلم کسی مسلمان کو کسی قسم کی اذیت نہ پہنچائے۔ تو وہ اگرچہ کلمہ گو نہیں ہے۔ مگر اس صفت میں مسلمانوں کا بھائی ہے۔

مَیں اس وقت آئینہ اسلام میں صلح اور امن کے وہ معیار نہیں دیکھنا چاہتا جو صرف ایک قوم یا ایک شہر یا ایک صوبہ یا ایک ملک میں امن قائم کر سکتے ہوں۔ بلکہ مَیں عالمگیر مذہب اسلام کے آئینہ میں صلح اور امن کی وہ تصویریں

دیکھنا چاہتا ہوں۔ جو تمام عالم میں امن و امان کا سکّہ چلا سکیں۔ اس لئے کہ اگر ایک گھر کے رہنے والے آپس میں صلح کر کے پڑوس والوں سے جنگ شروع کر دیں تو یہ صلح نہیں ہے۔ اگر ایک محلہ کے رہنے والے آپس میں صلح کر کے دوسرے محلّہ والوں سے جنگ کرنے لگیں۔ تو یہ صلح نہیں ہے۔ اگر ایک شہر کے رہنے والے اہل دیہات یا دوسرے شہر کے باشندوں سے جنگ کی ٹھان لیں تو یہ صلح اور امن نہیں ہے۔ اگر ایک صوبہ کے باشندے آپس میں اتحاد قائم کر کے دوسرے صوبوں کے باشندوں سے اختلاف شروع کر دیں۔ تو یہ امن اور صلح نہیں ہے۔ اگر ہندوستان کے رہنے والے آپس میں صلح اور اتفاق کر کے ایران یا جاپان یا دیگر ممالک سے جنگ شروع کر دیں۔ تو صلح اور امن کا مقصد حاصل نہیں ہوا۔ اس قسم کی صلح اور اتحاد کا مقصد (جو اس غرض سے کیا گیا ہو) امن اور صلح نہیں بلکہ بد امنی اور فساد کہنا چاہیئے۔

جو ممالک باہم برسرپیکار ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اپنے ملکوں اور اپنی اپنی قوموں میں اتنا اتحاد اور صلح قائم کر لیتے ہیں۔ کہ اپنے ملکوں کے امن سے فارغ ہو کر دوسرے ممالک کی طرف رُخ کرنے کے قابل ہو سکیں۔ لیکن اس نام نہاد صلح اور امن کے باوجود کرہ ارض خون سے رنگین رہتا ہے۔ اور سمندر کا شکم دن رات نت نئی غذاؤں سے پر ہوتا رہتا ہے۔

چونکہ ہر ملک اور ہر قوم کی باہمی صلح اور امن کسی عظیم تر فساد اور جنگ کے لئے سنگِ بنیاد ہوتا ہے۔ لہذا اس صلح کو صلح اور اس امن کو امن نہیں کہا جا سکتا۔

اس لئے میں قانونِ اسلام یعنی قرآن مجید میں وہ دائمی اصول اور معیار دیکھنا چاہتا ہوں۔ جو تمام دنیا میں صلح اور امن کے ضامن ہوں۔ یعنی ان کی

پابندی کے بعد ایشیا اور یورپ یا افریقہ وغیرہ کا سوال ہی نہ پیدا ہو سکے بلکہ ہر ملک اور ہر قوم موتیوں کی طرح ایک سلک میں پرونے کے قابل ہو جائے نہ کسی کا ہندوستانی ہونا جرم ہو نہ افریقی ہونا۔ نہ صرف یورپین ہونا کمال ہو نہ امریکن ہونا۔ نہ اس میں سیاہ رنگ اور سفید رنگ کا فرق ہو۔ اور نہ مشرقی اور مغربی کا۔ البتہ اگر فرق ہو تو صرف قانونِ اسلام کی پابندی اور نافرمانی کا اس مذہب کی کتاب باآواز بلند پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ۝
تم میں سب سے زیادہ عزت دار وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار و پابند قانون الٰہی ہو

قرآن مجید اور سیرت معصومین علیہم السلام اور ان کے حکیمانہ اور زرّیں اقوال اس قسم کے معیاروں کا غیر محدود اور انمول خزانہ ہیں۔ جن کی فہرست مکمل کرنا بھی ارباب ہمت کا کام ہے۔ مَیں اس وقت ان میں سے صرف چند اہم اور بنیادی معیار بطور نمونہ ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔ انہیں ملاحظہ کر کے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ ان میں سے ہر ایک معیار بجائے خود زندہ ثبوت ہے۔ کہ اسلام اور صرف اسلام صلح اور امن کا نہ صرف حامی بلکہ ضامن ہے۔

امن کا پہلا معیار

"حکومت کا حق صرف خدا کے چنے ہوئے رہبر کو ہے"

سب سے پہلے یہ غور کرنا چاہیئے۔ کہ حکومت کرنے کا حق کسے حاصل ہے اور کس کی بادشاہت میں امن قائم رہ سکتا ہے۔

انسان فطری طور پر مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔ یعنی انسان اپنی معاشرت

اور حیات وبقاء کیلئے مجبور ہے۔ کہ مل جل کر رہے اور بسے۔ اور اکٹھا ہو کر آباد ہو۔ اس لئے کہ قدرت نے ہر انسان کو محتاج بنا کر پیدا کیا ہے۔ اس لئے آج کوئی انسان نہیں۔ جو اپنے ضروریات زندگی پورا کرنے کیلئے ہزاروں انسانوں کا محتاج نہ ہو۔ انسان تو انسان ہم جانوروں۔ درختوں اور ان کے برگ وبار بلکہ تمام کائناتِ عالم کے محتاج ہیں۔ ہمارے ادنیٰ ترین ضروریات بھی اس وقت تک فراہم نہیں ہو سکتے۔ جب تک ہزاروں مخلوقات الہٰی اسی طرح ہماری مدد نہ کرے۔ جیسے ہم ان کی مدد کرتے ہیں۔ شہر ہوں یا دیہات ہر جگہ اگر کاشتکار تاجروں۔ پیشہ وروں اور زمینداروں کا محتاج ہے۔ تو زمیندار، کاشتکاروں تاجروں، پیشہ وروں کا محتاج ہے۔ بلکہ اسی طرح تاجر اور پیشہ ور دوسروں کے محتاج ہیں۔ بلکہ خود ایک پیشہ ور دوسرے پیشہ ور کا اور ایک تاجر دوسرے تاجر کا محتاج ہے۔ وہ بادشاہانِ ہفت اقلیم جو اپنے آپ کو سب سے زیادہ غنی اور بے نیاز سمجھتے اور زمین پر پیر نہیں رکھنا چاہتے وہ سب سے زیادہ محتاج ہیں غریب اور محتاج کے ضروریات اور لوازم حیات جس قدر کم ہیں، بادشاہوں کے ضروریات اسی قدر زیادہ ہیں۔ محتاج اپنے بہت سے ضروریات اپنے ہاتھ سے انجام دے سکتا ہے۔ لیکن بادشاہ اپنی ہر ادنیٰ ترین ضرورت کیلئے بھی دوسروں کا محتاج ہے۔ اگر کوئی شخص گوشہ نشینی کو پسند کر کے بادیہ نشین ہو جائے۔ اور یہ چاہے کہ میں بغیر کسی کی مدد کے اپنے تمام ضروریات خود مہیا کر لوں۔ تو حکماء کا فیصلہ ہے ہے۔ کہ کم از کم ایک ہزار برس کی کدوکاوش اور کوشش کے بعد ایک لقمۂ نان بشکل دہن تک پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے کہ گوشہ نشین انسان کو بھی غذا کی ضرورت ہے۔ اسے بھی زمین پر ہل چلانا۔ زراعت کرنا۔ دانے بونا۔ اور اسی طرح کے تمام لوازم انجام دینا ہیں۔ جن کے بغیر ایک گردۂ نان مہیا نہیں ہو سکتا۔ مثلاً

زمین کو گوڑنے اور نرم کرنے اور قابل کاشت بنانے کے لئے ہل چلانے کی ضرورت ہے۔ ہل اس وقت تیار ہوسکتا ہے۔ جب نجّار اور لوہار ملکر اُسے بنائیں۔ اگر گوشہ نشین انسان خود ہی بنالینا چاہے۔ تو پھر ہل بنانے کے لئے آلات کی ضرورت ہو گی۔ اور ان آلات کو بنانے کے لئے دوسرے آلات کی ضرورت ہو گی۔ اور نہیں معلوم کہ احتیاج کا یہ سلسلہ کھنچ کر کہاں تک پہنچے۔

اگر بالفرض یہ غیر ممکن بھی ممکن ہو جائے۔ تو پھر بھی بونے کیلئے غلہ کی ضرورت ہے اور غلہ انہیں شرائط اور مقدمات کا محتاج ہے۔ جو مشکلات آج درپیش ہیں۔ اگر بالفرض یہ تمام ناممکن ممکن ہو جائیں۔ تو پھر ہل چلانے کیلئے بیل یا کسی دوسرے قوی حیوان کی ضرورت ہے۔ اگر بالفرض یہ کام بھی خود ہی انجام دے لے تو پانی دینے کے لئے چاہ کی ضرورت ہے۔ اور کنواں کھودنے اور تیار کرنے کے لئے پھر مختلف قسم کے آلات کی ضرورت ہے۔ اور آلات مہیا کرنے میں پھر وہی مشکلات درپیش ہیں جن کا سابق میں ذکر ہوا۔ اور اگر بالفرض کنواں بہ اعجاز تیار ہو جائے۔ تو پانی کھینچنے کے لئے پھر ڈول اور رسی کی ضرورت ہے۔ اور ان کے بنانے کیلئے پھر آلات کی ضرورت ہے۔ اور آلات کیلئے پھر وہی مشکلات ہیں جن کا ذکر ہوا۔ اگر یہ مشکلات بھی حل ہو جائیں۔ اور زمین حسب ضرورت سیراب بھی ہو جائے۔ اور غلہ بھی تیار ہو جائے۔ اور گوشہ نشین خود ہی کٹائی کرنا جانتا ہو تو کٹائی کیلئے پھر آلات کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد غلّہ کو جدا اور صاف کرنے کے لئے دوسرے آلات کی ضرورت ہے۔ اگر یہ ناممکنات بھی ممکن ہو جائیں تو آرد تیار کرنے کے لئے چکی کی ضرورت ہے۔ اور چکی بنانے کے لئے پتھر اور آلات کی ضرورت ہے۔ اگر یہ عقدہ بھی کسی طرح حل ہو جائے۔ تو آرد خمیر کرنے کے لئے کسی ظرف کی ضرورت ہے۔ اور ظرف کیلئے پھر آلات کی ضرورت ہے۔

ظرف بھی مہیا ہو جائے۔ تو پھر آگ پر پکانے کیلئے توے کی ضرورت ہے۔ اور توے کیلئے پھر آلات کی ضرورت ہے۔ جب یہ تمام ناممکنات ممکن ہو جائیں۔ تو اب انسان اس قابل ہوا۔ کہ ایک لقمہ توڑ کر ہاتھ کی مدد سے دہن میں رکھے۔ لیکن ان کوششوں کے بعد بھی صرف چند گردہ نان تیار ہو سکے اس کے بعد دیگر ضروریات طعام یا لباس وغیرہ کا ان سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اس لئے حکماء کا یہ کہنا بالکل درست ہے۔ کہ گوشہ نشین انسان بمشکل ایک ہزار سال میں صرف ایک سادہ لقمہ دہن تک پہنچا سکتا ہے۔ یہ وجوہ ہیں۔ کہ انسان اپنی معاشرت بلکہ زندگی کیلئے مل جل کر رہنے سہنے اور ایک دوسرے سے مدد لینے پر مجبور ہے اس کے علاوہ چونکہ انسان اپنی فطرت میں خود غرض واقع ہوا ہے۔ اس لئے ممکن نہیں ہے۔ کہ انسان اپنے آپ کو ہر فائدہ میں مقدم نہ رکھے یا دوسروں کے نقصانات و تکالیف کا اسی طرح احساس کرے جس طرح اپنا احساس رکھتا ہے اس لئے ضرورت ہے۔ کہ ان خود غرض انسانوں کی معاشرت صحیح طریقوں پر قائم رکھنے کیلئے ایک ایسا قانون بنایا جائے جس کے مختلف دفعات ان مشکلات کو حل کر دیں۔ اور کسی کو ناجائز۔ خود غرضی یا زیادتی کرنے کا موقعہ نہ دیں۔ لیکن اگر اسی خطرناک اور مخدوش جماعت کو مجلس قانون ساز بنا دیا جائے۔ یا ان میں سے ایک یا چند افراد کو یہ حق دے دیا جائے۔ تو اولاً کبھی سب کے سب ایک رائے پر متحد نہ ہوں گے۔ اس کے علاوہ جن افراد کو قانون بنانے کا اختیار دیا جائے گا ممکن ہی نہیں کہ قانون بنانے والے اس میں اپنے ذاتی اغراض کا خیال نہ رکھیں یا دوسروں کے نقصانات کا اسی طرح احساس کریں۔ جیسا اپنا۔ یہ ظاہر ہے کہ کوئی مریض اپنا علاج خود نہیں کر سکتا۔ کوئی ناقص بغیر کسی کامل کی مدد کے اپنے آپ کو خود کامل نہیں بنا سکتا۔ اگر یہ لوگ قانون بنانے کے قابل ہوتے تو

ان میں یہ عیوب کیوں پیدا ہوتے۔
لہذا ضرورت ہے۔ کہ قانون وہ ہستی تیار کرے۔ جو اس جماعت کا جزو نہ ہو اور نہ ان کی طرح صاحب غرض ہو۔ بلکہ بے لوث اور بے غرض ہو۔ انصاف پر درہو ایسی ذات خالق حقیقی کے سوا کوئی نہیں۔ جس کے قبضۂ قدرت میں ہر ذی حیات کی جان ہے۔ سارا عالم جس کا محتاج ہے۔ اور جو خود کسی کا محتاج نہیں ہے۔ اسی قانون کو شریعت کہتے ہیں۔ اور اسی کا نام دوسرے الفاظ میں اسلام ہے۔
جب ایسا قانون خدا کے سوا کوئی نہیں بنا سکتا۔ تو اس کا سنانے والا۔ اس پر عمل کر کے دکھانے والا اور عمل کرانے والا وہی ہو سکتا ہے۔ جس کا انتخاب خود خدا کی جانب سے ہو اور یہ فریضہ خود اس کے حوالہ کرے یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ قانون بنانے والا رب ذوالجلال ہو۔ اور اسکی تعمیل کرانے والے ہمارے ایسے ناقص العقل اور گنہگار ہوں۔ ایسے بزرگ جو قانون الٰہی کے پہنچانے کے لئے خدا کی طرف سے منتخب ہوتے ہیں۔ انہیں کو زبانِ شریعت میں نبی۔ رسول۔ امام یا خلیفہ وغیرہ کے القاب وخطابات سے یاد کرتے ہیں۔
سچ تو یہ ہے کہ روحانی اور جسمانی ہر قسم کی حکومت کا حق صرف انہیں ہستیوں کو حاصل ہے۔ جو خدا کی طرف سے منتخب کی گئی ہوں اور کامل واکمل ہونے کے علاوہ بے عیب اور پاک ہوں۔ یہ اور بات ہے۔ کہ ان کے موجود ہوتے ہوئے ان کو حکومت کرنے کا موقع نہ دیا گیا ہو۔ لیکن درحقیقت یہ حق انہیں کا تھا اور ہے اور رہیگا۔ دنیا میں جس قدر فسادات خونریزیاں بدامنیاں پیدا ہوتی رہیں۔ یا آج پیدا ہو رہی ہیں۔ ان کا سبب صرف یہ ہے۔ کہ حکومت کی مہار ہمیشہ ہمارے ایسے انسانوں کے ہاتھ میں دی جاتی رہی اگر اسلام کی تعلیم کے مطابق حکومت کی مہار صرف خدا کے منتخب شدہ بزرگوں کے ہاتھ میں رہتی تو کبھی فساد یا بدامنی کا

سامنا کرنا پڑتا. جب جب اور جہاں جہاں خدا کے منتخب بزرگوں کو جنگ کرنا پڑی ہے اس کا سبب بھی صرف یہی ہے. کہ اگر زمین کے ایک خطّہ کی حکومت اُن کے حوالہ کردی گئی تو دوسرے خطہ کی حکومت پر اُن کے دشمن قابض رہے. جیسا کہ عہدِ رسولؐ کے تمام غزوات اس کے شاہد ہیں۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے.

الله اعلم حيث يجعل رسالته۔ (پ۸ ۲)
خدا بہتر جانتا ہے جہاں اپنی حکمت کا خزانہ رکھتا ہے.

الله يجتبي اليه من يشاء (پ۲۵)
خدا اپنے طرف جسکو چاہتا ہے چن لیتا ہے

الله يصطفي من الملائكة رسلا ومن الناس.
خدا ہی ملائکہ اور انسانوں سے پیغام رسانوں کا انتخاب کرتا ہے.

إن الحكم الا لله (پ ۱۳)
حکم کا حق صرف خدا کو ہے.

الا له الخلق والامر تبارك الله ربّ العالمين (پ۸ ۵)
(یاد رکھو خلق کرنا بھی اسی کا کام ہے اور امر کرنا بھی برکت والا ہے. وہ خدا. جو عالمین کا پالنے والا ہے)

وربك يخلق مايشاء ويختار ماكان لهم الخيرة
اور تمہارا خدا جو چاہتا ہے خلق کرتا ہے اور جسکو چاہتا ہے انتخاب کرتا ہے انہیں انتخاب کا کوئی حق نہیں

وكذالك يجتبيك ربك (پ۱۲ ۱۱)
اور اسی طرح خدا تیرا انتخاب کرتا ہے.

فاجتباه ربه فجعله من الصالحين. (پ۲۹ ۳)
پس خدا نے انہیں چن کر صالحین میں سے قرار دیا.

ان الله اصطفىٰ آدم و نوحاً وآل ابراهيم وآل عمران على العالمين ذرية
یقیناً خدا نے منتخب کرلیا آدم اور نوح اور آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام اہل عالم پر. جو ایک دوسرے کی

بعضها من بعض. (رپ ۳ ۱۲)

ذریت ہیں۔

وقال لهم نبيهم ان الله قد بعث لكم طالوت ملكا (رپ ۲ ۱۶)

اور ان سے ان کے نبی نے فرمایا کہ خدا نے تمہارے لئے طالوت کو حاکم مقرر کر دیا ہے۔

قال ان الله اصطفه عليكم وزاده بسطة فى العلم والجسم. (رپ ۲ ۱۵)

فرمایا کہ خدا نے اسے تمہارا حاکم مقرر کر دیا ہے اور اسے علم و جسم کی طاقت تم سے زیادہ بخشی ہے۔

ولقد اتينا ال ابراهيم الكتاب والحكمة وملكا عظيما

یقیناً ہم نے آل ابراہیم کو کتاب اور حکمت اور ملک عظیم بخشا ہے۔

ثم اورثنا الكتاب الذين اصطفينا من عبادنا.

پھر ہم نے ان لوگوں کو کتاب کا وارث قرار دیا جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے چن لیا

قال يا موسى انى اصطفيتك برسالاتى. (رپ ۹ ۷)

فرمایا اے موسیٰ میں نے اپنے پیغاموں کیلئے تمہارا انتخاب کر لیا۔

ولقد اصطفينه فى الدنيا وانه فى الاخرة لمن الصلحين. (رپ ۱ ۱۶)

یقیناً ہم نے ان کو دنیا میں چن لیا اور وہ ضرور آخرت میں صالحین سے ہوں گے۔

وسلام على عباده الذين اصطفى. (رپ ۲۰ ۲)

اپنے جن بندوں کو خدا نے چنا ہے ان پر سلام ہو۔

ووهبنا له من رحمتنا اخاه هرون نبيا (رپ ۱۶ ۷)

اور ہم نے اپنی رحمت سے ان کا بھائی ہارون نبی کو انہیں بخش دیا۔

ولقد اتينا موسى الكتاب

یقیناً ہم نے موسیٰ کو کتاب عنایت

وجعلنا معه اخاه هارون وزيرا. (رپ ۱۹ ۲)

کی اور ان کے ساتھ ان کے بھائی ہارون کو وزیر مقرر کیا ۔

ولوطا اتيناه حكما وعلما (رپ ۱۷ ۵)

اور ہم نے لوط کو حکم اور علم بخشا.

اتيناه حكما وعلما (رپ ۲ ۴)

ہم نے انہیں حکم اور علم بخشا.

واجعل لى وزيرا من اهلى هارون اخى. (رپ ۱۶ ۱۱)

اور میرے اہل سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنا دے ۔

واذ قال ربك للملائكة انى جاعل فى الارض خليفة. (رپ ۱ ۳)

اور یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک قائم مقام مقرر کرنے والا ہوں ۔

يا داؤد انا جعلناك خليفة فى الارض فاحكم بين الناس بالحق. (رپ ۲۳ ۱۱)

اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ مقرر کیا اب لوگوں میں انصاف سے فیصلے کرو ۔

وجعلناهم ائمة يهدون بامرنا. (رپ ۱۷ ۵)

اور ہم نے ان کو امام قرار دیا وہ ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے ۔

وعد الله الذين امنوا منكم وعملوا الصالحات ليستخلفنهم فى الارض كما استخلف الذين من قبلهم

خدا نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے جو تم میں صاحب ایمان اور پاک عمل والے ہیں کہ انہیں وہ ضرور خلیفہ بنائیگا زمین میں اسی طرح جیسے تم سے پہلے قائم مقام بناتا رہا ۔

انى جاعلك للناس اماما. (رپ ۱ ۱۵)

(اے ابراہیم) میں تمہیں لوگوں کا امام بنانے والا ہوں ۔

ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلھم ائمۃ ونجعلھم الوارثین (پ ۲۰ ع ۴)

ہمارا ارادہ یہ ہے کہ ہم ان لوگوں پر احسان کریں جنہیں زمین میں کمزور کرنے کی خواہش کی گئی اور انہیں کو امام بنائیں اور انہیں کو وارث۔

واجعلنا للمتقین اماما.

اور ہمیں متقیوں کا امام قرار دے۔

(یاد رکھو کہ جو خدا خلق کرنے والا ہے امر کرنے کا بھی اسی کو حق ہے)

الا لہ الخلق والامر

لہذا خدائی قانون کا سنانے والا صرف خدا کے انتخاب سے مقرر ہو سکتا ہے۔

یہ خیال نہ ہو۔ کہ خدا کے چنے ہوئے صرف روحانی تبلیغ کر سکتے ہیں۔ ایسے دنیاوی حکومت کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ خدا کی جانب سے انہیں حضرات کا انتخاب ہو سکتا ہے۔ جو علم و عمل عصمت و طہارت اور تمام کمالات میں کامل و اکمل ہوں۔ اگر ان میں حکومت کرنے کی صلاحیت نہ ہوتی۔ تو نہ وہ کامل ہو سکتے تھے۔ اور نہ خدا کی جانب سے ایسے ناقص کا انتخاب ہو سکتا تھا اگر وہ کامل تھے۔ تو ان میں حکومت کرنے کی صلاحیت ضرور تھی۔ البتہ غلط کار حکومت کی نہیں بلند کردار حکومت کی۔

یاد رہے۔ کہ حکومت اور انتظام ملک شریعت سے الگ اور جداگانہ چیزیں نہیں ہیں۔ شریعت اس قانون کا نام ہے۔ جو روحانی اور جسمانی ہر قسم کے کامل ترین تعلیمات کی ذمہ دار ہو۔ دنیا کا کوئی شخصی یا ملکی یا قومی ایسا عقدہ نہیں جس کا حل شریعت میں موجود نہ ہو۔ جو شریعت ان تمام عقدوں کو حل نہ کر سکے اور رہبانیت کی تعلیم دے۔ وہ قانون الٰہی نہیں ہے۔ لہذا جب تک حکومت کی باگ بندوں کے چنے ہوئے افراد کے ہاتھوں میں رہے گی۔ فساد اور خونریزی

بھی ہوتی رہے گی۔

جب کوئی شخص اور کوئی قوم ذاتیات سے محفوظ نہیں ہے۔ اور نہ رہ سکتی ہے۔ تو اگر اسلام کی تعلیم کے مطابق تمام دنیا کی حکومت صرف خدا کے منتخب افراد کے ہاتھوں میں دیدیجائے۔ تو کبھی فساد یا بدامنی نہیں ہو سکتی۔ یہ ہے اسلام کی سب سے پہلی تعلیم اگر اس پر عمل کیا جائے تو اسلام امن اور صلح کا ضامن ہے۔

امن کا دوسرا معیار

اسلامی مساوات

اس میں شک نہیں کیا جا سکتا۔ کہ اسلام نے ہر حکم سے زیادہ صلح اور امن کی تاکید کی ہے۔ اور فساد و خونریزی سے روکا اور منع کیا ہے۔ بلکہ اس نظریہ کو اعمال و عبادات کے پردہ میں بھی ملحوظ رکھا ہے۔ جیسے ارشاد فرماتا ہے۔

واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا۔ واذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخواناً الخ

خدا کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہو۔ اور خدا کی نعمت کو یاد کرو۔ جب تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ پس اُس نے تمہارے دلوں کو اسطرح جوڑ دیا کہ تم اسکی نعمت کی بدولت ایک دوسرے کے بھائی ہو گئے

دوسرے مقام پر ارشاد فرماتا ہے۔

ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا

(اصلاح کے بعد زمین میں فساد نہ کرتے پھرو)

پھر ارشاد ہوتا ہے

فاتقوا اللہ واصلحوا ذات بینکم (خدا سے ڈرو اور آپس میں اصلاح کرو)

پھر ارشاد ہوتا ہے۔

لاخیر فی کثیر من نجواھم الّا من امر بصدقۃ او معروف او اصلاح بین الناس۔ (انکی بہت سی باتوں میں کوئی اچھائی نہیں سوا اس شخص کے جو صدقہ یا نیکی یا آپس میں اصلاح کا حکم دے)

پھر ارشاد ہوتا ہے۔

الصلح خیر (صلح اچھی چیز ہے)

اسی طرح قرآن مجید کے بہت سے آیات میں صلاحیت اتفاق اور امن قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ بلکہ اسلام کے بہت سے احکام اسی غرض سے دیے گئے ہیں۔ کہ دنیا میں اتحاد اور امن قائم ہو سکے۔ بلکہ اسلام کے ابتدائی دور میں جن غزوات اور لڑائیوں کی نوبت آئی ہے۔ ان کی غرض بھی صرف اصلاح و قیام امن تھا۔ جیسا کہ خداوند عالم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے۔

وقاتلوھم حتی لاتکون فتنۃ ویکون الدین للہ۔ (ان سے اتنا ہی لڑو کہ فتنہ و فساد مٹ جائے۔ اور دین صرف خدا کا ہو کر رہے)

ساتھ ہی ساتھ دوسرے مقام پر ارشاد فرماتا ہے۔

والفتنۃ اشد من القتل (فتنہ و فساد قتل سے زیادہ سخت ہے)

چونکہ اسلام نے صلح اور امن کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اس لئے ضروری تھا۔ کہ اسلام کچھ ایسے قانون بنا دے۔ کہ جب تک ان کی تعمیل ہوتی رہے۔ دنیا فساد و خون ریزی سے محفوظ اور صلح و امن کا گہوارہ بنی رہے۔ اس لئے اسلام نے اپنے اہم ترین قوانین کے پردے میں اس کمی کو شد و مد سے پورا کیا ہے کہ

اگر اسلام اپنے وحید و فرید ہونے پر ناز کرے تو بالکل بجا ہے۔

اسلامی مساوات کو جناب امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے ان الفاظ میں سمجھایا ہے۔

الناس من جهة التمثال اكفاء (شکل و شباہت کے لحاظ سے سب انسان برابر ہیں
ابوهم آدم والام حواء سب کے باپ حضرت آدم اور ماں حضرت حوا ہیں)

اسی مفہوم کو سعدی شیرازی نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

ع بنی آدم اعضائے یک دیگر اند

اسلام نے کبھی یہ گوارہ نہیں کیا۔ کہ ایک اقلیم یا ایک ملک کے رہنے والوں کو دوسرے اقالیم یا ممالک کے باشندوں پر ترجیح دی جائے۔ پھر اسلام یہ کیونکر گوارہ کر سکتا تھا۔ کہ ایک ہی ملک کے رہنے والوں کو جماعتوں پر تقسیم کر دے یا قومیت کے لحاظ سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دیدے یا دولتمندوں کو محتاجوں کا سردار بنا دے۔ یا ارباب سطوت سے مرعوب ہو کر تاج شاہی ان کے سروں پر رکھ دے۔ اسلام نے تو یہ حکم عام دیا ہے۔

وان تابوا واقاموا الصلوٰة واتوا الزكوٰة فاخوانكم فى الدين۔ (اگر افریقہ یا امریکہ یا چین کے رہنے والے بھی کفر و شرک سے توبہ کریں اور نماز و زکوٰۃ کے پابند ہو جائیں تو وہ تمہارے بھائی ہیں۔)

دین اور حق کے معاملہ میں نہ سیاہ و سفید کا فرق ہے۔ اور نہ مشرق و مغرب کا۔ اگر دین ایک ہے۔ تو امریکہ کا رہنے والا بھی حقیقی بھائی کے برابر ہے۔ اور اگر دین ایک نہیں ہے۔ تو حقیقی بھائی بھی غیروں سے بدتر ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ اسلام نے بیل بکری کو ایک لکڑی سے ہنکانا چاہا ہے۔ جو انصاف کے خلاف ہے۔ نہیں بلکہ اسلام نے تفوق کے لئے ایک

معیار بھی مقرر کیا ہے اور وہ یہ ہے۔

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم — تم میں سب سے زیادہ عزت دار وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔

چاہے کسی ملک اور کسی قوم سے ہو لیکن اگر پرہیزگار اور پابند قانون اسلام ہے۔ تو بڑے سے بڑے خاندان والوں سے بہتر ہے۔ اور اگر بہترین خاندان کا نمائندہ تقویٰ اور پرہیزگاری کی دولت سے محروم ہے۔ تو وہ اس غلام حبشی سے بدتر ہے۔ جس کے عمل اس سے بہتر ہوں۔ عمل ہی وہ جوہر انسانیت ہے۔ جس کی بدولت ایک غلام حبشی سید قریشی پر فوقیت حاصل کر سکتا ہے۔ جون حبشی غلام حضرت ابوذر غفاری یقیناً ان قریشیوں سے کروڑ درجہ بہتر تھا۔ جو امکان کے باوجود کربلا میں شرف شہادت سے محروم رہے۔ ہزاروں مسلمانوں کے ہوتے ہوئے مسجد نبوی میں اذان کے لئے بلال حبشی کا انتخاب کیا جاتا ہے جن کی زبان سے بعض حروف صاف نہیں ادا ہو سکتے تھے۔ اور (ش) کی بجائے (س) نکلتا تھا۔ ہزاروں عربی النسل اصحاب کی موجودگی میں صرف ایک فارس کا رہنے والا صحابی جو سلمان کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ زبان رسول سے

منا اھل البیت (سلمان) ہم اہل بیت سے ہے۔

کے خطاب کا حقدار قرار پاتا ہے۔ جب دو دو مسلمانوں کے درمیان صیغۂ اخوت پڑھا جاتا ہے۔ تو فارس کے رہنے والے سلمان عرب کے رہنے والے ابوذر غفاری کے بھائی قرار دیئے جاتے ہیں۔ اگرچہ قوم کے لحاظ سے ان میں دور کا بھی رشتہ نہیں لیکن ان کے ایمان کا وزن قریب قریب برابر ہے۔

میدان کربلا کے شہیدوں میں ایرانی بھی ہیں۔ اور عرب بھی۔ افریقہ کے رہنے والے بھی ہیں۔ اور ترکستان کے بھی۔ یورپ کے رہنے والے بھی ہیں اور دیگر ممالک

کے بھی۔ غلام بھی ہیں اور آزاد بھی۔ جوان بھی ہیں اور ضعیف بھی ہیں اور بچے بھی مگر جتنے شہید تھے۔ آج وہ سب چند بزرگوں کے علاوہ ایک ساتھ ایک ہی جگہ دفن ہیں۔ جس کو گنج شہیداں کہتے ہیں۔ حالانکہ اس میں ہاشمی اور مطلبی اور ابوطالبی بلکہ فاطمی بھی شامل ہیں۔ اور آج بھی ایک غلام ایک سردار کے پہلو میں آرام کر رہا ہے۔

یہ ہے اسلام کی وہ مساوات جس نے کبھی انصاف کا خون نہیں ہونے دیا جس نے کبھی کسی حقدار کو اس کے حق سے محروم کرنا گوارہ نہیں کیا۔ جس نے مخالف جذبات برانگیختہ نہیں ہونے دیئے۔

اگر دنیا میں یہ مساوات جو اسلام نے قائم کرنا چاہی تھی۔ قائم رہ جاتی۔ تو نہ کبھی ملکی تعصب پیدا ہوتے نہ قومی۔ نہ صنفی سوالات پیدا ہوتے نہ شخصی بلکہ ہر شخص یہ سمجھتا۔ کہ اگر وہ نیک عمل کرے۔ تو بڑی سے بڑی ترقی کر سکتا ہے۔ اگر جرم کا خوگر ہو جائے۔ تو بدترین انسانوں سے زیادہ ذلیل و خوار ہو سکتا ہے۔ اسلام نے کسی انسان کے لئے کوئی حد مقرر نہیں کی۔ جس سے وہ نہ کم ہو سکتا ہو۔ اور نہ زیادہ ہو سکتا ہو۔ اگر کسی انسان کو یقین ہو جائے۔ کہ اسے جو بلند ترین درجہ حاصل ہے۔ یہ کبھی پستی سے نہیں بدل سکتا۔ تو پھر اس کے دل میں عمل کرنیکا شوق نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح اگر کسی انسان کو یہ یقین ہو جائے۔ کہ میں جو کچھ بھی کروں اس پست درجہ سے کبھی بلند نہیں ہو سکتا۔ تو اس کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔ جذبات عمل فنا ہو جاتے ہیں۔ اسلام نے ہر شریف و وضیع اور پست و بلند کو یہ سمجھا دیا ہے۔ کہ وہ پست سے پست بھی ہو سکتا ہے۔ اور بلند سے بلند بھی۔ نہ اسکی پستی کی کوئی حد مقرر ہے اور نہ بلندی کی۔

آج ہمارا یہ حال ہے۔ کہ اگر ہم دوسروں کے مقابلہ میں اچھی غذا استعمال

کرلیں۔ یا اُن سے بہتر لباس پہن کر گھر سے باہر نکلیں۔ تو ہم دوسرے بندگان خدا کو ذلیل سمجھنے لگتے ہیں۔ اپنے اوپر فخر و مباہات کرنے لگتے ہیں۔ دوسروں کی تذلیل و توہین کو اپنی انتہائی عقلمندی سمجھنے لگتے ہیں۔ غریبوں اور محتاجوں کو خود سے سلام کرنا کیسا اُن کے سلام کا جواب دینا گراں گذرتا ہے۔ لیکن حضرت امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام عید کے دن بھی پھٹی ہوئی قمیص پہنے ہوئے جَو کی روٹیاں نوش فرما رہے ہیں۔ ایک ہمدرد ادب کے ساتھ عرض کرتا ہے۔ کہ یا علی آج تو عید کا دن ہے۔ آج تو اچھے کپڑے پہن لیجئے۔ آج تو اچھا کھانا نوش فرمایئے۔ تو جواب میں ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ اگر علیؑ کو یقین ہو جائے۔ کہ آج خدا کے ہر بندے نے سیر ہو کر حسب دل خواہ کھانا کھایا ہے۔ اور حسب ضرورت اچھا لباس پہنا ہے تو علیؑ یہ جرأت کر سکتا ہے۔ کہ وہ بھی اچھا لباس پہن لے۔ یا اچھی غذا استعمال کرے لیکن جب تک علیؑ کو یہ یقین نہ ہو جائے۔ اور خدا کے ایک بندہ کو بھی بھوک یا برہنگی کی شکایت رہے گی۔ اس وقت تک، علیؑ خوشگوار غذا اور خوشنما لباس استعمال نہیں کر سکتا۔

آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی یہ عادت تھی۔ کہ محتاج ترین انسانوں کے ساتھ بوریئے پر بیٹھ کر کھانا تناول فرمالیا کرتے تھے۔ اور ان کے پہلو میں بیٹھ کر ان کی تسلّی کے لئے فرمایا کرتے تھے۔

مسکین جالس مسکینا

(ایک محتاج دوسرے محتاج کیساتھ بیٹھا ہے)

یہ جو کچھ بھی ہوتا رہا کسی مجبوری سے نہ تھا۔ خدا کا دیا ہوا سب کچھ تھا۔ جو دن رات بیواؤں، یتیموں، محتاجوں کے لئے وقف رہتا تھا۔ یہ ایثار صرف اسی لئے تھا۔ کہ کل کسی انسان کو بارگاہ احدیت میں یہ شکایت کرنے کا حق نہ رہے۔ کہ میں بھوکا رہا اور میرے امام نے سیر ہو کر کھانا کھایا، یا میں برہنہ رہا اور میرا امام لباس

فاخرہ سے آراستہ و پیراستہ رہا۔

نماز و روزہ، خمس، و زکوٰۃ، حج، و جہاد، یہ سب مساوات اسلامی کے نمونے بلکہ مدرسے ہیں۔ گویا مسلمانوں کو ہر دن اور ہر وقت مساوات کی تعلیم دی جاتی ہے۔

نماز جماعت میں ایک دولت مند یا بادشاہ کو ہرگز یہ حق نہیں ہے۔ کہ وہ جب داخل مسجد ہو تو اگلی صف میں اسے ضرور جگہ دی جائے۔ اور نہ یہ حق ہے کہ دولت مندوں کی صف محتاجوں کی صف سے علیحدہ ہو۔ بلکہ یہ حکم ہے۔ کہ جو نمازی جب آئے۔ اس وقت جس صف میں جگہ مل جائے۔ بلا کسی ترمیم یا تغیر کے اسی جگہ کھڑا ہو جائے۔ ہو سکتا ہے۔ کہ اپنے غلام یا خادم کے پہلو میں کھڑا ہونا پڑے جسے پہلو میں بٹھانا گوارہ نہ تھا۔ اب وہ اٹھتے بیٹھتے ہر حالت میں پہلو سے پہلو ملائے ہوئے ایک ہی حالت میں ساتھ ساتھ ہے۔ پھر بھی آقا یا سردار کے ماتھے پر شکن نہیں آتی۔ بلکہ اسی حالت میں دونو خوش ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ خادم اگلی صف میں کھڑا ہو چکا ہو۔ اور بادشاہ اس کی پشت پر پچھلی صف میں کھڑا ہو جائے۔ بادشاہ کا رُخ اسی طرف ہو۔ جس طرف خادم کی پشت ہے۔ اور جب دونو سجدے میں جائیں۔ تو جہاں خادم کے قدم ہوں وہیں بادشاہ کا سر ہو۔ اسلام کی اس عملی مساوات کے بعد ممکن ہی نہیں۔ کہ دولتمندوں کے دماغ میں تکبر کی بو باقی رہ سکے اگر ایک جاہل یا بدچلن بادشاہ بن گیا ہو۔ تو اسے بادشاہ ہونے کی وجہ سے یہ حق حاصل نہیں۔ کہ نماز جماعت بھی وہی پڑھائے۔ بادشاہ ہونے کے باوجود اُسے امام جماعت کے پیچھے کھڑا ہونا پڑے گا۔ امام جماعت وہی ہو سکتا ہے جو عالم باعمل اور نیک اطوار اور قابل اعتبار ہو۔ خواہ وہ رعایا یا محکوم ہو یا فقیر و محتاج۔ نماز جماعت میں ہر ملک۔ ہر قوم اور ہر حیثیت کے لوگ برابر سے شامل ہو سکتے ہیں۔ اور کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کو مسجد یا صف جماعت سے

باہر نہیں کر سکتا۔ کوئی سردار غلاموں سے یہ نہیں کہہ سکتا۔ کہ یہ سرداروں کی مسجد ہے۔ اس میں غلاموں کو نماز پڑھنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ ورنہ قرآن مجید آواز دے گا۔

ومن اظلم ممن منع مساجد اللہ ان یذکر فیھا اسمہ، الخ — اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو خدا کی مسجدوں میں خدا کے ذکر سے روکے اور منع کرے

روزہ کا مقصد بھی یہی تھا۔ کہ کل تک ارباب دولت کے وسیع دستر خوان بچھے ہوئے تھے رنگ رنگ کی نعمتیں چنی ہوئی تھیں۔ غریب و محتاج للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ مگر کچھ بس نہیں چلتا تھا۔ ان کے پیٹ میں آگ لگی ہوئی تھی۔ مگر شکم پر کرنے کیلئے جو کی روٹی بھی میسر نہ تھی۔ لہذا کم از کم سال میں ایک ماہ تک دن بھر کے لئے دونوں ایک ہی شکل اختیار کرلیں۔ ممکن ہو یا ناممکن مگر کوئی دانہ اڑ کر حلق تک نہ جا سکے۔ جن چیزوں سے محتاجوں پر اجتناب فرض ہے۔ انہیں چیزوں سے دولتمندوں کو۔ نہ روزے کی حدوں میں فرق ہے نہ شرائط میں۔ بلکہ ہر مسلمان ایک ہی صورت میں نظر آتا ہے۔ جو لوگ پہلے سے فاقہ کشی کے عادی تھے۔ انہیں کم تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ لیکن جو لوگ ہر وقت کھانے پینے کے عادی تھے۔ جن کے پاس ہر وقت رنگ رنگ کی نعمتیں موجود تھیں۔ انہیں جو تکلیف محسوس ہوگی۔ اس کا اندازہ انہی کو ہو سکتا ہے۔

خمس و زکوۃ کا مقصد بھی یہی تھا۔ کہ اہل دولت عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور محتاج کراہ کراہ کر راتیں گذار رہے تھے۔ ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی اگر خبر تھی۔ تو ہمدردی اور احساس نہ تھا۔ اس لئے روزے واجب کر کے دونوں میں احساس پیدا کر دیا گیا۔ اور نماز میں تعارف کرا کے تکبر کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اب ہر دولت مند پر فرض ہے کہ مال خمس سے سادات کی اور مال زکوۃ سے غیر سید

کی اعانت کرے۔ تاکہ محتاج کسی حد تک دولت مندوں کے ہمدوش ہو سکیں۔

حج بیت اللہ مساوات کی زندہ تصویر ہے۔ جس میں دنیا کے ہر گوشہ سے حج بیت اللہ ادا کرنے والے آتے ہیں۔ اور ایک ہی حالت میں شامل ہو کر ایک ساتھ حج کرتے ہیں۔ دنیا کی ہر قوم اور ہر ملک کے انسان اس میں برابر سے حصّہ لیتے ہیں۔ اور کسی ملک یا کسی قوم یا کسی شخصیت کو اس میں امتیاز حاصل نہیں ہے۔ مناسک حج یعنی حج کے تمام عبادات میں ہر شخص مساوی طور پر شریک ہوتا ہے۔ اپنے اپنے وطنوں میں لباسوں میں فرق تھا۔ سر کے بالوں کی وضع میں فرق تھا۔ رفتار میں فرق تھا۔ ہر نشست و برخواست میں امتیاز تھا۔ مگر حج ادا کرتے کے وقت نہ لباس میں فرق ہے۔ نہ سر کے بالوں میں فرق ہے۔ نہ رفتار میں فرق ہے نہ نشست و برخواست میں فرق ہے۔ سب کے سب کفن کی طرح احرام باندھے ہوئے سر کے بال منڈوائے ہوئے کبھی صفا و مروہ کے درمیان دوڑتے ہوئے کبھی خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے کبھی مشعر حرام اور منا میں اپنے فرائض ادا کرتے اور جاتے آتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نہ صورت بدل سکتی ہے۔ نہ حالت تبدیل ہو سکتی ہے۔ نہ وقت میں فرق آسکتا ہے۔ پھر جو کچھ ہوتا ہے۔ وہ مل جُل کر ساتھ ساتھ ادا ہوتا ہے۔ اس سے بڑھ کر مساوات کا مظاہرہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

میدان جہاد کی صف بندی سپاہیوں کا مل جُل کر اپنی اپنی ہمت کے نمونے پیش کرنا۔ اور سروں کی بازی لگا دینا حدود اسلام کی حفاظت کیلئے جان و مال کی قربانیاں پیش کر دینا۔ پھر آخرت کے سوا دنیا میں کسی یقینی منفعت کی امید نہ ہونا یہ وہ ضروری شرائط ہیں۔ جن کے بغیر جہاد نہیں ہو سکتا۔ پھر اس پر طرّہ یہ ہے۔ کہ جذبات سے کام نہ لینا۔ ذاتیات کا دخل نہ ہونے دینا۔ اس وقت تک جنگ کرنا۔ جب تک فتنہ فرو نہ ہو۔ اور اسلام اور حق خطرہ سے محفوظ نہ ہو جائیں ان

مقاصد کے حصول کے بعد ذاتیات کیلئے جنگ کرنا اسی طرح حرام ہے۔ جیسے
اس سے پہلے فرار حرام تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اسلام نے جس قدر احکام مسلمانوں
کو دیئے ہیں۔ ہر حکم کے پردہ میں مساوات کا راز مضمر ہے۔ اس لئے میں کہہ
سکتا ہوں کہ تعلیم مساوات میں اسلام کو جو وحدت و انفرادیت حاصل ہے۔ اسے
کبھی صفحۂ ہستی سے نہیں مٹایا جا سکتا۔

حد یہ ہے کہ جو کفار تلواریں نیام میں رکھ لیں اور مسلمانوں کے مقابلہ سے باز
آجائیں۔ اور مسلمانوں کو جزیہ دے کر ان کے حلقہ بگوش ہو جائیں۔ انسانی مساوات
کو مدنظر رکھتے ہوئے اسلام ان پر بھی کسی قسم کا تشدد روا نہیں رکھتا بلکہ ان کی جان
و مال۔ عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمہ داری لے لیتا ہے۔ اور ان سے وہی سلوک
کرتا ہے۔ جو ایک انسان کو انسانی برادری سے کرنا چاہیئے۔

مسئلہ غلامی جسے بظاہر مساوات بلکہ انسانیت کے لئے ایک داغ تصور کیا جاتا
ہے۔ اسے صرف اس لئے قائم رکھا گیا کہ اسلامی مساوات اور عدل میں رخنے
نہ آجائیں۔ تعلیمات اسلام و شعائر دین سے ناواقف نومسلموں کو مسلمانوں کے
گھروں میں تقسیم کر کے اولاً تو انہیں کسب معاش اور خانہ داری کے
جھگڑوں سے بے نیاز کر دیا جاتا ہے اسکے علاوہ مسلمانوں کا ہر گھر اپنے متعلقہ غلاموں
کے لئے اسلامی تہذیب کا گہوارہ اور اسلامی اخلاق و احکام کا ایک مدرسہ بن جاتا
ہے۔ ایک طرف آقاؤں کو بار بار یہ ہدایت کہ غلاموں کو آزاد کرنے میں اس قدر
ثواب ہے۔ یا فلاں جرم کا کفارہ غلام کو آزاد کرنا ہے۔ دوسری طرف آقا کا نام
اس کے غلام کے لئے اور غلام کا نام اس کے آقا کے لئے اس کے وارثوں کی
فہرست میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور وہ ایک نہ ایک وقت میں ایک دوسرے
کے وارث ہو سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ اخوت اور برادری اور کیا ہو سکتی ہے۔

کہ رشتہ داروں کی طرح ایک دوسرے کا وارث ہو سکتا ہے۔ اور جب غلام آزاد ہو جائے تو آقا اور غلام میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ نہ اسلامی معارف و معلومات یا ایمانی درجات میں آقا اور غلام کے درمیان کوئی فرق ہے اور نہ اسلام کے عبادات و احکام میں نماز و روزہ و حج و دیگر عبادات کے مسائل و احکام جو قرآن و حدیث میں درج ہیں۔ اس کے زندہ ثبوت ہیں۔ بلکہ عبادات و احکام میں مشکلات کے بجائے غلاموں کو زیادہ سہولتیں دی گئی ہیں۔

ہر صاحب فہم یہ سمجھ سکتا ہے۔ کہ دنیا کی بدامنی، فسادات، خونریزیاں اور جھگڑوں کا دار و مدار تکبر، تفوق، خود پسندی ذاتیات اور ترک مساوات پر ہے۔ اگر یہ بنیادی بیماریاں دور کر دی جائیں تو پھر اختلافات پیدا ہی نہیں ہو سکتے۔ اگر آج دنیا اسلام کی تعلیمات پر عمل کرنے لگے۔ تو قدرتی طور پر خود بخود تمام اختلافات رفع ہو سکتے ہیں۔ اور فرش زمین امن اور صلح کا گہوارہ بن کر خون کے دھبوں سے صاف رہ سکتا ہے۔

امن کا تیسرا معیار

عدل و انصاف

دنیا میں وہ مذہب امن و امان قائم کر سکتا ہے۔ جس کی بنیاد عدل و انصاف پر قائم ہو۔ یا عدل و انصاف جس کا شعار ہو۔ اس لئے کہ دنیا کے تمام تر فسادات اور اختلافات کی بنیاد صرف نا انصافی، ظلم اور خود پسندی پر ہے۔ دو شخصوں میں اختلاف اسی وقت ہوتا ہے۔ جب ایک دوسرے کے ساتھ انصاف نہیں کرتا دو قومیں اسی وقت آپس میں جنگ کرتی ہیں۔ جب ان میں سے انصاف اٹھ

جاتا ہے۔ دو بادشاہ اسی وقت برسرِ پیکار ہوتے ہیں۔ جب وہ دونوں یا ان میں
سے ایک عدل و انصاف کا پابند نہیں رہتا۔ یہی ناانصافی ہے۔ جس کی حکومتیں
شکار ہوگئیں۔ جس نے ہزاروں اور لاکھوں خاندانوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ جس
نے کروڑوں انسانوں کو بے خانماں کر دیا۔ جس نے بے شمار مخلوق خدا کو تیغ کے
گھاٹ اتار دیا۔ جس نے عالم کے ذرّہ ذرّہ میں وہ انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ جو قیا
تک نہیں مٹ سکتا۔ آج دنیا میں جہاں جہاں فسادات نظر آتے ہیں۔ انکی بنیاد
یہی ظلم ہے۔ کہیں بھائی کو بھائی کی ناانصافی کی شکایت، کہیں رشتہ داروں کو
رشتہ داروں کی ناانصافی کی شکایت، کہیں زمینداروں کو اپنے سرگردہ کی ناانص
کی شکایت، غرض تمام دنیا صرف ظلم اور ناانصافی کا شکار ہے۔ اگر آج را
اور رعایا، بادشاہ اور رعیت، حاکم و محکوم، دولتمند اور محتاج، بڑے اور چھوٹے
اغیار اور رشتہ دار آپس میں عدل و انصاف کے پابند ہو جائیں تو دنیا میں بدا
اور فساد کی بنیاد نہ رہنے پائے۔ ظاہر ہے۔ کہ جو مذہب مساوات اور اتحاد کی تع
دیتا ہو۔ ممکن ہی نہیں۔ کہ اس میں ناانصافی اور ظلم کو روا رکھا گیا ہو۔ یا عدل و
انصاف کی پرورش نہ کی گئی ہو۔ قرآن مجید کے آیات اور رہبران اسلام کی
کی سیرت اس قسم کے احکام اور واقعات سے اس طرح لبریز ہیں۔ کہ ان کا ادنیٰ
ترین جزو بھی اس مختصر رسالہ میں تحریر نہیں کیا جا سکتا۔ کہیں ارشاد باری تعالیٰ
ہوتا ہے۔

وامرت لاعدل بینکم الله ربنا وربکم لنا اعمالنا ولکم اعمالکم لاحجة بیننا وبینکم کلمة الله

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں خدا ہمارا اور تمہارا پالنے والا ہے ہمارے عمل ہمارے لئے ہیں اور تمہارے عمل تمہارے لئے ہیں ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی حجت نہیں

یجمع بنینا۔

صرف خدا کا کلمہ ہمیں اور تمہیں جمع کرسکتا ہے

پھر ارشاد فرماتا ہے۔

قل امر ربی بالقسط (پ ۱۰)

کہدو کہ خدا نے مجھے انصاف کیلئے حکم دیا ہے

پھر ارشاد فرماتا ہے۔

ان اللہ یامر بالعدل والاحسان (پ ۱۴)

یقیناً خدا عدل و انصاف کا حکم دیتا ہے۔

پھر ارشاد فرماتا ہے۔

ان اللہ یامرکم ان تودوا الامانات الی اھلھا ج واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل ط ان اللہ نعما یعظکم بہ ط ان اللہ کان سمیعا بصیرا (پ ۵)

یقیناً خدا تمہیں یہ حکم دیتا ہے کہ امانتیں انکے حقداروں کو پہنچادو۔ اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کرو۔ یقیناً خدا تمہیں بہترین نصیحت کرتا ہے۔ کیونکہ وہ بڑا سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

پھر ارشاد فرماتا ہے۔

یاایھا الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط شھداء للہ ولو علی انفسکم او الوالدین والاقربین ج ان یکن غنیا او فقیرا فاللہ اولی بھما قف فلا تتبعوا الھوی ان تعدلوا وان تلوو ا او تعرضوا فان اللہ کان

اے ایمان والو! مضبوطی کیساتھ انصاف پر قائم رہو۔ اور خدا لگتی گواہی دو اگرچہ اپنے نفسوں یا ماں باپ اور رشتہ داروں کیلئے مضر ہو خواہ دولتمند ہو یا محتاج بہرحال خدا تم سب سے زیادہ مہربان ہے تم انصاف کو چھوڑ کر خواہش نفسانی کی پیروی نہ کرو۔ اور اگر گھما پھرا کر گواہی دوگے۔ یا بالکل انکار کروگے۔ تو یاد رہے کہ تم جو کچھ کرتے ہو

بما تعملون خبیراً (پ ۵ ر ۱۷) خدا اس سے خوب واقف ہے۔

جناب رب العزت نے قرآن مجید میں عدل و انصاف کا اس قدر عام حکم دیا ہے کہ اس سے کسی کو مستثنیٰ نہیں کیا۔ بلکہ کھلے ہوئے الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے کہ میں بھی ہمیشہ عدل و انصاف کرتا ہوں۔ اے میرے رسول تم بھی انصاف کرنا۔ اور حکام اسلام بھی ہمیشہ انصاف کے پابند ہیں۔ اور رعایا بھی باہم ایسا انصاف کرے کہ اس کے مقابلہ میں نہ ماں باپ کی پرواکریں۔ نہ رشتہ داروں کی حد یہ ہے کہ اپنا نقصان برداشت کرلیں۔ لیکن دامن عدل و انصاف ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔

اسلام کے عدل و انصاف کا یہ عالم ہے۔ کہ اگر کفار جزیہ دینا منظور کرلیتے ہیں۔ اور یہ چاہتے ہیں۔ کہ ہمیں اپنا دین چھوڑنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ اور ایک دوسرے کی حفاظت اور عزت کا ذمہ دار ہو جائے۔ تو اسلام اسے بخوشی منظور کرلیتا ہے۔ حالانکہ اپنے دین سابق یعنی کفر پر قائم ہیں۔ پھر بھی اسلام اور اہل اسلام ان کی جان و مال و عزت و آبرو کی حفاظت کے ذمہ دار ہو جاتے ہیں۔ ان کی حمایت میں انکے دشمنوں سے جنگ کرتے ہیں۔ اپنا سر دیتے ہیں۔ مگر ان پر آنچ نہیں آنے دیتے۔ اور نہ انھیں اس بات پر مجبور کرتے ہیں۔ کہ وہ مذہب اسلام قبول کرلیں۔ اس لئے کہ انہیں معلوم تھا۔ کہ عدل و انصاف ہمارا پہلا فرض ہے۔ ایفاء عہد ہماری حیات سے زیادہ مقدم ہے۔ اور اسلام وہی ہے جو خوشی سے منظور کیا جائے۔ جو اسلام جبر و اکراہ سے اختیار کیا جائے۔ وہ اسلام نہیں ہے۔ قرآن مجید کا کھلے ہوئے الفاظ میں یہ فرمان ہے۔

لا اکراہ فی الدین (پ ۳ ر ۱) دین میں زبردستی نہیں ہے۔

حضرت امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام حجاز سے عراق تک کے مسلمانوں کے بادشاہ ہیں۔ کوفہ دارالسلطنت ہے۔ عبدالرحمن بن ملجم کوفہ میں موجود ہے اور

آپ مسلمانوں کو خبر بھی دیتے ہیں کہ یہ مجھے قتل کرے گا۔ لوگ عرض کرتے ہیں۔ کہ مولا اس وقت سے پہلے آپ اسے قتل کیوں نہیں کر دیتے۔ تو آپ جواب دیتے ہیں کہ ابھی اس سے جرم سرزد نہیں ہوا ہے۔ جرم سے پہلے سزا کیونکر دی جاسکتی ہے اور جب آپ کو مسجد کوفہ میں شہید کرکے ابن ملجم گرفتار ہو کر آتا ہے۔ تو آپ وصیت فرماتے ہیں۔ کہ اگر میں زندہ رہا تو مجھے اختیار ہے جو چاہوں سزا دوں۔ اور اگر میں اس جہان فانی سے رخصت ہو جاؤں۔ تو عبدالرحمٰن کو صرف ایک ضربت لگانا۔ اس لئے کہ اس نے بھی مجھے صرف ایک ضربت لگائی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ انصاف کے خلاف ہو جائے۔

حضرت عقیل آپ کے بڑے بھائی جن کے اہل و عیال بہت ہیں۔ آپ کی خدمت میں آکر آپ کے عہد حکومت میں عرض کرتے ہیں۔ کہ مجھے میرے حصہ سے کچھ زیادہ عطا کیا جائے۔ تو آپ ایک سیخ آہنی آگ میں گرم کرکے فرماتے ہیں۔ "ہاتھ بڑھاؤ اس پر رکھ دوں!" وہ عرض کرتے ہیں۔ کہ میرا ہاتھ جل جائے گا۔ آپ فرماتے ہیں کہ تم دنیا کی آگ سے اس قدر ڈرتے ہو۔ اور مجھے دوزخ کی آگ میں ڈالنا چاہتے ہو۔ میں اُسے کیونکر برداشت کروں گا۔

آپ بیت المال میں تشریف فرما ہیں۔ چراغ جل رہا ہے۔ اور مال کا حساب کیا جا رہا ہے۔ جب وہ کام ختم ہو جاتا ہے۔ اور ایک شخص ذاتی گفتگو شروع کر دیتا ہے تو آپ چراغ گل کر دیتے ہیں۔ اور اندھیرے میں باتیں کرنے لگتے ہیں۔ وہ عرض کرتا ہے۔ مولا آپ نے چراغ کیوں گل کر دیا۔ آپ فرماتے ہیں اس چراغ میں بیت المال کا تیل جل رہا ہے۔ جب تک بیت المال کا کام ہو رہا تھا۔ اس کا جلانا جائز تھا۔ اب میری اور تمہاری ذاتی گفتگو ہو رہی ہے۔ اس لئے بیت المال کا مال صرف کرنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔

یہ ہے اسلام کا وہ عدل وانصاف جس پر اسلام کو ناز ہے۔ اور رہے گا۔ اگر دنیا میں یہی عدل وانصاف یہی حقوق اللہ اور حقوق الناس کی حفاظت قائم رہ جاتی۔ تو آج فساد اور بدامنی کا نام ونشان تک نہ ہوتا۔ یہ صرف ہماری بدعملیاں اور ناانصافیاں ہیں جو جنگ عظیم بن کر بار بار ہمارے سروں پر منڈلاتی رہی ہیں اور عذاب الیم بن کر ہمیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔

امن کا چوتھا معیار

عفو ومغفرت

معافی اور بخشش وہ بہترین حربے ہیں۔ جو پتھر کو پانی کر دیتے ہیں۔ بغض وعناد کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو بجھا دیتے ہیں۔ کدورت کی دلدل کو صاف وشفاف کر کے آئینہ بنا دیتے ہیں۔ اختلاف اور فساد کے ابلتے ہوئے چشموں کو بند کر سکتے ہیں وہ لوگ جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں۔ ان میں امن وصلح کی لہر دوڑا سکتے ہیں۔

ہر انسان میں فطری طور پر انتقام کے جذبات موجود ہوتے ہیں۔ جب کسی شخص کو یہ محسوس ہو جائے۔ کہ اس کے ساتھ برائی کی گئی ہے۔ تو اس سے بڑھ چڑھ کر اس کا عوض اور انتقام لینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اگر اسے تھوڑی سی تکلیف پہنچتی ہے۔ تو وہ اس سے کئی درجہ زیادہ عوض خود لینا چاہتا ہے۔ حالانکہ بعض اوقات درحقیقت فریق ثانی کا جرم ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات دوسرا فریق عمداً جرم نہیں کرتا۔ البتہ اتفاقاً اس سے یہ جرم سرزد ہو جاتا ہے۔ اور بعض اوقات فریق ثانی کی طرف سے نہ عمداً نہ سہواً کسی طرح کوئی جرم سرزد نہیں ہوتا لیکن

انتقام لینے والے کو اپنی تیز طبعی یا غفلت یا غلط اخبار یا بدنفسی کی وجہ سے یہ شبہ ہو جاتا ہے۔ کہ فلاں شخص یا جماعت نے اس پر ظلم کیا ہے۔ حالانکہ واقعہ اور اصلیت اس کے خلاف ہوتے ہیں۔ ہر دو صورتوں میں جب ایک فریق دوسرے سے بطور خود انتقام لیتا ہے۔ تو فریق ثانی کے جذبات اسے اس سے بھی بڑھ کر انتقام لینے پر مجبور کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صدیوں تک صرف ایک انتقام کی حدیں نہیں ختم ہوتیں۔ اور یہی انتقام بہت بڑے فساد و خونریزی اور بدامنی کا سنگ بنیاد قرار پا جاتا ہے۔ جیسے اوس و خزرج کی جنگ آج تک صفحات تاریخ پر یادگار ہے اگر اس کے بجائے جذبات کو قابو میں رکھا جائے، طبیعت اور عقل و دماغ کی مہار کو ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔ خدا کے رحم و مغفرت سے سبق لیکر اپنے زیردستوں یا ہم جنسوں پر رحم کیا جائے۔ جذبات انتقام کو دبا دیا جائے۔ خطاؤں کو معاف کر دیا جائے۔ عفو و بخشش اور مراعات سے کام لیا جائے۔ تو اختلافات اگر پیدا بھی ہو جائیں۔ تو آن کی آن میں مٹ سکتے ہیں۔ قرآن مجید میں خاص طور پر عفو و بخشش کا حکم دیا گیا ہے۔ اور رہبران اسلام نے عفو و بخشش کے اس قدر نمونے پیش کئے ہیں۔ جن کا شمار دشوار ہے۔ جس کے صرف چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے۔

ومن یعمل سوءً او یظلم نفسہ ثم یستغفر اللہ یجد اللہ غفوراً رحیماً۔ (پ ۵ ع ۱۳)	جو شخص برا کام کرے۔ یا اپنے نفس پر ظلم کرے پھر خدا سے توبہ کرے۔ تو خدا کو بزرگ اور مہربان پائے گا۔

دوسری آیت میں ارشاد فرماتا ہے۔

نبئ عبادی انی انا الغفور الرحیم (پ ۱۴ ع ۴)	میرے بندوں کو خبر دیدو کہ میں بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہوں۔

تیسری آیت میں ارشاد فرماتا ہے۔

وربك الغفور ذوالرحمة لو یؤاخذهم بما کسبوا العجل لهم العذاب بل لهم موعد لن یجدوا من دونه موئلا (پ ۱۵ ر ۲۰)

تمہارا پروردگار بڑا بخشنے والا مہربان ہے اگر انکے عملوں کی بازپرس کرتا تو ان پر فوراً عذاب نازل کر دیتا نہیں بلکہ ان کیلئے وعدہ کا دن مقرر ہے اس سے بچنے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔

چوتھی آیت میں ارشاد فرماتا ہے۔

هو الذی یقبل التوبة عن عباده ویعفوا عن السیئات ویعلم ما تفعلون۔ (پ ۲۵ ر ۴)

وہ خدا وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔ اور گناہ معاف کر دیتا ہے اور خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔

پانچویں آیت میں ارشاد فرماتا ہے۔

وآخرون اعترفوا بذنوبهم خلطوا عملاً صالحاً وآخر سیئاً عسی الله ان یتوب علیهم ط ان الله غفور رحیم خذ من اموالهم صدقة تطهرهم وتزکیهم بها وصل علیهم ان صلوتك سکن لهم (پ ۱۱ ر ۲)

اور کچھ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کر لیا ہے اور اچھے اور برے کاموں کو ملا دیا ہے قریب ہے کہ خدا انکی توبہ قبول کرلے یقیناً خدا بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔ انکے مالوں سے صدقہ لے لو۔ اور اس کے ذریعہ سے انہیں پاک کردو۔ اور ان پر نماز پڑھو کیونکہ تمہاری نماز انکے سکون کا باعث ہے۔

چھٹی آیت میں ارشاد فرماتا ہے۔

فاعف عنهم واستغفر لهم وشاورهم فی الامر۔ (پ ۴ ر ۸)

اے رسولؐ انھیں معاف کر دو۔ اور انکے لئے بخشش طلب کرو۔ اور ان سے کسی کام کے وقت مشورہ لے لیا کرو۔

ساتویں آیت میں ارشاد فرماتا ہے۔

خذ العفو وامر بالعرف و اعرض عن الجاھلین (پ ۹ ر ۱۴)

اے رسول تم درگذر کردیا کرو۔ اور اچھے کام کا حکم دو۔ اور جاہلوں کی طرف سے منہ پھیر لو۔

آٹھویں آیت میں ارشاد فرماتا ہے۔

وجزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللہ انہ لا یحب الظالمین۔ (پ ۲۵ ر ۵)

(حالانکہ) برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے پھر بھی جو شخص معاف کردے اور معاملہ کی اصلاح کرے۔ تو اس کا ثواب خدا کے ذمہ ہے اور خدا یقیناً ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

نویں آیت میں ارشاد فرماتا ہے۔

وان تعفوا وتصفحوا وتغفروا فان اللہ غفور رحیم (پ ۲۸ ر ۱۶)

اور اگر تم معاف کردو۔ اور روگردانی کرلو۔ اور بخش دو تو یقیناً خدا بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

دسویں آیت میں ارشاد فرماتا ہے

ولمن صبر وغفر ان ذالک لمن عزم الامور (پ ۲۵ ر ۵)

اور البتہ جو شخص صبر کرے اور قصور معاف کردے تو بیشک یہ بڑے حوصلہ کے کاموں میں سے ہے۔

ان آیات میں جناب رب العزت نے مکرّر ارشاد فرمایا ہے۔ کہ میرا کام بخش دینا معاف کردینا۔ درگذر کرنا ہے۔ اے رسولؐ تم بھی بخش دیا کرو معاف کردیا کرو۔ درگذر کردیا کرو۔ ذرا ذراسی بات پر بگڑ نہ جایا کرو۔ غلطی کرنے والے کو اتنا موقع بھی دیا کرو کہ وہ اپنی اصلاح کرسکے۔

بیشک جب انتقام لینے کا موقع اور ضرورت ہو۔ تو ضرور انتقام لینا چاہیئے مگر کسی خطا کے معاف کردینے کے بعد جو جذبہ محبت مجرم میں پیدا ہوسکتا ہے وہ کسی دوسری صورت سے ممکن نہیں ہے۔ اگر دشمن دوست بن سکتا ہے۔ تو صرف عفوو

بخشش کے ذریعہ

خدا کے بھیجے ہوئے رہبروں کو جو تکلیفیں پہنچائی گئی ہیں۔ اگر وہ انتقام کے لئے کمربستہ ہوجاتے۔ توان کی عمریں انتقام میں گزر جاتیں۔ پھر بھی صحیح اور پورا انتقام نہ لیاجا سکتا۔ اس لئے وہ سب سے بڑا حربہ جو استعمال کرتے تھے۔ وہ معافی اور درگزر ہے۔ اگراس کے ثبوت میں انبیاء ومرسلین اور رہبران اسلام کے واقعات کی فہرست مرتب کی جائے۔ توایک مستقل کتاب ہوجائے گی۔ جس دل میں خطائیں معاف کرنے کے جذبات ہوں گے۔ اس میں لازمی طور پر خضوع ہوگا، خشوع ہوگا، انکسار ہوگا، خوف خدا ہوگا، مہربانی ورحم ہوگا، خلق خدا پر ترس ہوگا، جذبات سخاوت ہوں گے انسانی ہمدردی ہوگی۔ حضرت امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا بیواؤں اور یتیموں کے گھر کھانا یا پانی پہنچانا۔ اپنا باغ فروخت کر کے مساکین پر تقسیم کردینا اور اپنے لئے کچھ بھی محفوظ نہ رکھنا۔ بچوں کا اسیطرح فاقہ سے پڑا رہنا اسی عفوومغفرت رحم ورواداری اور ہمدردی کے نتائج تھے۔

ایک دن کا واقعہ ہے۔ کہ حضرت امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام جناب سیّدہ عالم کے لئے ایک انار خرید کرتے ہیں۔ راہ میں معلوم ہوتا ہے۔ کہ فلاں مومنہ علیل ہے۔ اس کی عیادت کے لئے تشریف لے جاتے ہیں۔ مزاج پرسی کے بعد اس سے دریافت فرماتے ہیں کہ کسی چیز کو دل چاہتا ہے۔ وہ جواب میں عرض کرتی ہے۔ کہ انار کو دل چاہتا ہے۔ آپ فوراً انار کے دو حصے کرتے ہیں۔ ایک حصہ اس کو دیتے ہیں اور دوسرا سیدہ عالم کے لئے محفوظ رکھتے ہیں۔ جب وہ کھا چکتی ہے۔ تو کہتی ہے کہ اگر نصف انار اور ہوتا تو بہتر تھا۔ آپ باقی نصف انار بھی اس کے حوالہ کر دیتے ہیں۔ اور خالی ہاتھ گھر واپس تشریف لاتے ہیں۔ یہ بالکل درست ہے۔ کہ ایک مریض کو اپنے پاس سے انار دے دینا اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ لیکن اس شخص

کیلئے جس نے یہودیوں کے باغ میں مزدوری کر کے بمشکل کچھ مال حاصل کیا ہو. اور گھر میں اس کے پردہ دار کو مرض کی وجہ سے انار کی ضرورت ہو. مال دینا اس قدر کم ہو کہ بمشکل اس سے صرف ایک ہی انار خریدا جا سکا ہو. گھر میں اس کا انتظار اور انار کی ضرورت ہو. ان حالات میں انار دیدینا آسان بات نہیں ہے. یہ وہ منزل ہے جو مساوات سے کہیں زیادہ بلند ہے. اسی منزل کی طرف قرآن مجید میں اشارہ کیا گیا ہے۔

ویؤثرون علیٰ انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ — کچھ ایسے لوگ بھی ہیں کہ جو اپنے اوپر دوسروں کو مقدم رکھتے ہیں اگرچہ انہیں خود ضرورت ہوتی ہے

ایک دن کا واقعہ ہے. کہ امام حسین علیہ السلام کی کنیز سے کوئی غلطی سرزد ہوتی ہے. آپ اس پر غضبناک ہوتے ہیں. وہ سر جھکا کر قرآن مجید کی یہ آیت پڑھتی ہے

الکاظمین الغیظ — اپنے غصّہ کو روکنے والے۔

فوراً فرماتے ہیں. اچھا میں نے تمہاری خطا کو معاف کیا. اس کے بعد وہ آیت کا دوسرا حصّہ پڑھتی ہے۔

والعافین عن النّاس — لوگوں کی خطائیں معاف کرنے والے۔

آپ نے فوراً فرمایا. کہ اچھا آج سے میں نے تمہیں آزاد کیا۔

دنیا جانتی ہے. کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کیلئے جو فضا تیار کی گئی تھی. اسکا یہ نتیجہ لازمی تھا. کہ اگر واقعہ کربلا اس صورت سے. اس وقت. اس جگہ نہ گزرتا تو کسی نہ کسی وقت کسی نہ کسی جگہ اور کسی نہ کسی طرح امام حسین علیہ السلام کو ضرور شہید کیا جاتا. پھر بھی جو صورت حال رونما ہوئی. اور جس طرح فرزند رسولؐ کربلا میں آ کر گھیر لئے گئے. اس کا بہت بڑا سبب حر بن یزید ریاحی کا رسالہ اور وہ طرز عمل قرار پاتا ہے جو اس نے ملاقات کے وقت سے کربلا تک اختیار کیا تھا۔

اس کے باوجود جب عاشور کے دن حُر کو اپنے جرم کا احساس ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے فرزند اور برادر اور غلام سمیت لشکر ابن سعد سے نکل کر امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور سر نیاز خم کر کے اور دست ادب باندھ کر عرض کرتا ہے۔ کہ مولا میں وہی مجرم ہوں۔ جس نے آپ کو مدینہ واپس نہ ہونے دیا تھا۔ اور اس میدان میں لایا تھا۔ کیا اب ممکن ہے۔ کہ میری خطا معاف فرما دی جائے۔ تو سرکار حسینی سے جواب ملتا ہے۔ کہ کیوں نہیں۔ اگر تم دل سے معافی چاہتے ہو۔ تو تمہاری خطا ضرور معاف ہو سکتی ہے۔ حُر اپنے جذبات دلی اور صداقت کے ثبوت میں اسی وقت اذن جہاد طلب کرتا ہے۔ اور امام اپنی رضامندی کے ثبوت میں اسے روکتے ہیں۔ اور اصرار کے بعد اذن جہاد دیتے ہیں۔ اور حُر شہید ہو کر وہ سرخروئی حاصل کرتا ہے۔ جو قیامت تک یاد کی جاتی رہے گی۔ گنہگار کے دل میں ترک جرم کا جذبہ اور جاں نثاری کا شوق پیدا کرنے والا جوہر صرف عفو مغفرت اور رافت و رحمت ہے۔ اس لئے خداوند عالم سرور کائناتؐ کے لئے ارشاد فرماتا ہے:۔

فبما رحمت من الله لنت لهم ولو كنت فظا غليظ القلب لانفضوا من حولك۔

یہ بھی خدا کی مہربانی ہے۔ کہ اے رسولؐ تم نرم دل واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر تم ترش مزاج اور سخت دل ہوتے تو تمہارے گرد و پیش بیٹھنے والے بھی تمہیں چھوڑ کر تتر بتر ہو جاتے

امن کا پانچواں معیار
صرف خدا سے خوف

خدا کے وجود اور اس کے سمیع و بصیر، علیم و قدیر ہونے پر یقین۔ روز محشر حشر و نشر ثواب و عقاب، جنت اور دوزخ، خدا کے انصاف پر پورا پورا اعتماد۔ یہ وہ بہترین معیار ہے۔ کہ اگر یہ درجہ حاصل ہو جائے۔ تو پھر نہ پولیس کی ضرورت ہے۔ نہ فوج کی۔ نہ ملازمان سرکاری کی حاجت ہے نہ حکام کی۔

دنیا کی بدامنیاں، اور فسادات کا بہت کچھ دار و مدار اس بات پر ہے۔ کہ ہمیں خدائے لایزال کے وجود پر پورا یقین نہیں۔ اور اگر ہے تو اُسے اپنی طرح کمزور محتاج بے طاقت، اور بے بس سمجھتے ہیں۔ اگر اس پر بھی یقین ہے۔ تو یہ تصوّر نہیں ہوتا کہ قیامت ضرور آئے گی۔ ہمارے نیک و بد اعمال کا حساب اور معائنہ ضرور ہوگا ہمارے اچھے اور بُرے اعمال کا ضرور وزن کیا جائے گا۔ ہم جیسا عمل کریں گے۔ اس کے برابر جزا و سزا ملے گی۔ ہمارے اعمال ہی ہم کو جنت میں بھی لے جا سکتے ہیں اور دوزخ میں بھی۔ نا اہل جنت میں نہیں جا سکتے۔ اور اہل دوزخ سے محفوظ رہیں گے یہ بھی یقین نہیں۔ کہ ہمارے ساتھ ظلم اور نا انصافی نہیں کی جائے گی۔ جو جیسا کرے گا ویسا پائے گا۔

من یعمل مثقال ذرۃٍ خیراً یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃٍ شراً یرہ۔

جو شخص ذرہ برابر نیکی کریگا اس کا انعام پائیگا اور جو شخص ذرہ برابر برائی کرے گا۔ اس کی سزا پائے گا۔

ہمارا یہ حال ہے۔ کہ ہم بادشاہوں سے ڈرتے ہیں۔ حکّام سے ڈرتے ہیں۔ ملازمان

سرکاری سے ڈرتے ہیں۔ فوج اور پولیس سے ڈرتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ حکومت کے چپڑاسیوں سے ڈرتے ہیں۔ جو حکومت کا عطا کیا ہوا لباس پہن لے اس سے ڈرتے ہیں۔ ارباب دولت سے ڈرتے ہیں۔ اپنے شہر یا گاؤں کے سرداروں اور بڑوں سے ڈرتے ہیں۔ پہلوانوں اور بہادروں سے ڈرتے ہیں۔ برابر والوں سے ڈرتے ہیں حد یہ ہے۔ کہ عالم خیال میں آکر بھوت کے نام سے ڈرتے ہیں۔ پریت اور چڑیل کے نام سے ڈرتے ہیں۔ دیو کے نام سے ڈرتے ہیں۔ حشرات الارض سے ڈرتے ہیں۔ درندوں سے ڈرتے ہیں۔ غرض خدا کے سوا ہر ایک مخلوق سے ڈرتے ہیں اور نہیں ڈرتے تو خدا سے۔ حالانکہ قرآن مجید میں خداوند عالم کا ارشاد یہ ہے۔

اتقوا اللہ حق تقاتہ (خدا سے اسطرح ڈرو جسطرح ڈرنا چاہیے)

اتخشونھم واللہ احق ان تخشوہ۔ (کیا تم مخلوق خدا سے ڈرتے ہو حالانکہ خالق حقیقی زیادہ حقدار ہے کہ اس سے ڈرا کرو۔)

یہی وجہ ہے۔ کہ جب ہم کوئی کام کرتے ہیں تو اس میں کبھی بھائیوں کا لحاظ ہوتا ہے۔ کبھی بزرگوں کا۔ کبھی رشتہ داروں کا۔ کبھی احباب کا، کبھی اپنی قوم کا، کبھی اپنے وطن یا اپنے ملک کا۔ اگر نہیں لحاظ ہے تو خدا کا۔ اور خدا والوں کا۔ اگر ہم یہ تصور کرلیں۔ کہ ہمارا مالک موجود ہے۔ وہ ہمیں اور ہماری حرکات و سکنات کو دیکھ رہا ہے۔ ہماری نیت سے باخبر ہے۔ وہ قرآن میں وعدہ کر چکا ہے۔

ونکتب ما قدموا واثارھم (پ ۲۲) (لوگ جو عمل کرتے ہیں۔ اور جو اس کے اثر ہیں وہ بھی ہم انکے نام پر لکھتے رہتے ہیں)

اسے سہو و نسیاں نہیں ہو سکتا۔ ہمارا ہر عمل لکھا جاتا ہے۔ اور قیامت تک محفوظ رہے گا۔ اور ہمارے سامنے پیش کیا جاوے گا۔ اور جو قابلیت وہ کتاب پیش کرے گی اس کے مطابق عوض ملے گا۔ ہمیں صرف وہ کام کرنا چاہیے جس سے

راضی ہو جائے۔ بندوں کو راضی کرنا فرض نہیں۔ خدا کو راضی کرنا ضروری ہے
غیر خدا کا خوف دل سے نکل جائے۔ اور صرف خدا کا خوف دل میں آجائے تو
کوئی ظلم سرزد نہیں ہو سکتا۔ اسی کا نام امن و امان ہے۔
دنیا کی پولیس انہی کاموں کی نگرانی کر سکتی ہے۔ جو اس کے روبرو ہوں
ے واقعات بھی دنیا میں ملتے ہیں۔ کہ رات کا وقت ہے۔ اکیلا مکان ہے۔ پردہ
حائل ہے۔ اکیلا آدمی ہے۔ کوئی دیکھنے والا نہیں۔ شراب کی بوتل سامنے
موجود ہے۔ بظاہر کوئی روکنے والا نہیں۔ کوئی مخبری کرنے والا نہیں۔ کوئی گرفتار
کرنے والا نہیں۔ کوئی سزا دینے والا نہیں۔ پھر بھی ایک خدا پرست اور خدا ترس
انسان شراب کی طرف سے منہ پھیر لیتا ہے۔ اور شراب پینے کا خیال بھی دل میں
نہیں آنے دیتا۔ وہ کیا چیز تھی۔ جو اسے شراب پینے سے روک رہی تھی۔
سچ یہ ہے۔ کہ جہاں حکومتیں بیکار ہو جاتی ہیں۔ پولیس کا دسترس نہیں ہوتا
جہاں سپر انداختہ ہو جاتی ہیں۔ نگہبان تھک کر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہاں صرف
ان خدا کام آتا ہے۔ خدا پرستی دستگیری کرتی ہے۔ قدرت رہبری کرتی ہے
توفیق الٰہی نگہبانی کرتی ہے۔
معلوم ہوا۔ کہ صرف خدا کا خوف وہ کام کر سکتا ہے۔ جو نہ فوجیں کر سکتی ہیں
نہ حکومتیں۔ اسلام اور اہل اسلام کی واحد کتاب قرآن مجید کے تعلیمات کا
دارومدار صرف خوف خدا پر ہے۔ وہ عبادت عبادت نہیں کہی جا سکتی۔ جس
میں خلوص نیت اور خوف خدا نہ ہو۔ بلکہ اسے خود نمائی ریاکاری یا نفس پرستی
کہا جاتا ہے۔ رسول اسلام اور ان کی پاک اور مقدس اولاد کی عادت تھی۔ کہ
جب نماز کے لئے وضو کرنے بیٹھتے تھے۔ تو چہرہ کا رنگ زرد ہو جاتا تھا۔ جب
وضو سے فارغ ہو کر مصلّے کا رخ کرتے تھے۔ تو ان کے رونگٹے کھڑے

ہو جاتے تھے۔ جب مصلّے پر تشریف رکھتے تھے۔ تو اعضا میں رعشہ ہونے لگتا تھا۔ جوڑ بولنے لگتے تھے۔ جب خدا کا ذکر آتا تھا۔ تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ یہی وہ کیفیت ہے۔ جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔

یخرّون للاذقان ویبکون (وہ اپنی ٹھڈیاں زمین پر رگڑتے ہیں اور روتے ہیں)

جب حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں۔ تو خدا کی طرف توجہ کا یہ عالم ہوتا ہے۔ کہ وہ تیر جو میدان جنگ میں پیر میں لگا تھا۔ اور نکالنے میں اذیت ہوتی تھی۔ قیام کی حالت میں آپ کے فرزند امام حسن علیہ السلام کے مشورہ سے نکال لیا جاتا ہے۔ مصلّے خون سے رنگین ہو جاتا ہے۔ مگر آپ کو محسوس بھی نہیں ہوتا کہ کیا ہوا۔

اس توجہ اور خوف خدا اور خلوص نیت کے باوجود دعائے کمیل میں کمیل کو یہ سبق یاد کرا رہے ہیں۔ کہ پروردگارا گناہ تو اس قدر ہیں۔ کہ ان کی کثرت کی وجہ سے مغفرت کی امید نہ ہونا چاہیئے۔ لیکن صرف اس لئے امید ہے۔ کہ یہ جانتا ہوں۔ کہ بہر حال تیری مغفرت میرے گناہوں سے وسیع تر ہے۔ غزوہ لیلۃ الہریر میں آپ کی نماز کا یہ حال ہے۔ کہ ایک شب و روز مسلسل جنگ جاری ہے۔ فریقین کی فوجیں ایک دوسرے میں پڑ گئی ہیں۔ اور میدان جنگ میں دونوں صفوں کے درمیان مصلیٰ نماز بچھا ہوا ہے۔

کان یصلی والسھام (حضرت علی مرتضیٰ) اس وقت نماز پڑھ رہے تھے
تقع بین یدیہ۔ جب آپ کے سامنے تیروں کا مینہہ برس رہا تھا۔

کربلا کا چٹیل میدان ہے۔ لاکھوں دشمنوں کے حصار میں صرف بہتر۷۲ اصحاب ہیں۔ جن میں سے اکثر جام شہادت نوش کر کے سر کٹائے سامنے پڑے ہوئے ہیں۔ دھوپ کی شدت اور پیاس کا غلبہ ہے۔ ہر سپاہی لوہے میں ڈوبا ہوا ہے۔ نماز

ظہر کا وقت آگیا ہے۔ عبادت گذار سپاہی خاک پر تیمم کر کے صفیں باندھ رہے ہیں اور اس حالت میں نماز جماعت ہو رہی ہے۔ کہ امام اور ماموم سب پر تیروں کا مینہ برس رہا ہے۔ پھر بھی نمازیوں کے خضوع و خشوع میں کوئی فرق نہیں ہے۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کمسنی کے زمانہ میں مدینہ سے روانہ ہو کر تنہا اور پیدل ایک ریگستان سے گذر رہے ہیں۔ اور حج بیت اللہ کے لئے مکہ معظمہ کا ارادہ ہے۔ ایک صحابی جو اتفاقاً راہ میں مل گیا ہے۔ دریافت کر رہا ہے۔ یہ طویل اور خطرناک سفر اور آپ تنہا۔ نہ مرکب ہے نہ سامان خورد و نوش ہے۔ آخر کدھر کا ارادہ ہے۔ تو کمسن شہزادہ بیساختہ جواب دیتا ہے۔

زادی تقوی و راحلتی رجلای — میرا زاد راہ خوف خدا ہے اور سواری میرے قدم ہیں۔
وقصدی مولای — اور ارادہ اپنے مولا کیجانب ہے

اگر انسان میں یہ توکل، یہ اطمینان، یہ حوصلہ، یہ خوف خدا، یہ جرأت اور نڈری پیدا ہو جائے۔ اور دنیا اور اہل دنیا سے اس قدر بے نیازی اور بے پروائی آجائے۔ کہ سر کٹ جائیں۔ گھر لٹ جائیں، وطن چھٹ جائے، کنبہ اسیر ہو جائے سب کچھ قربان ہو جائے۔ مگر ناحق اور باطل کے ہاتھ پر بیعت نہیں کریں گے اور ڈریں گے تو صرف خدا سے ڈریں گے۔ چاہے جو کچھ گذر جائے۔ مگر دین کو دنیا کے ہاتھ فروخت نہ ہونے دیں گے۔ جیسے حضرت امام حسین علیہ السلام نے اکیلا رہ جانے کے بعد بھی لاکھوں دشمنوں کی پرواہ نہ کی۔ اور وہ قربانی پیش کر گئے۔ جس کی نظیر ملنا اسی طرح ناممکن ہے۔ جیسے امام حسین علیہ السلام کا دوبارہ پیدا ہو کر شہید ہونا محال ہے۔ تو کوئی شبہ نہیں۔ کہ دنیا میں امن و امان قائم ہو سکتا ہے۔

امن کا چھٹا معیار

"حدود اسلامی کا اجراء"

مانا کہ ہر حکومت اپنے ملک میں شخصی اور قومی جرموں کے انسداد کے لئے کچھ نہ کچھ تدبیر کرتی ہے. مختلف قسم کے مجرموں کے لئے کم یا بیش سزائیں مقرر کی جاتی ہیں لیکن عام طور سے ان میں یہ نقص ہوتا ہے. کہ ہر حکومت نے اکثر جرموں کے لئے ایسی سزائیں مقرر کی ہیں. جن کا وزن سبک ہے. اور جو آسانی سے برداشت کی جاسکتی ہیں. اس لئے مجرم جس طرح رفتہ رفتہ جرم کرتے کرتے جرم کے عادی ہو جاتے ہیں. اسی طرح سزایاب ہوتے ہوتے سزائیں برداشت کرنے کے بھی عادی ہو جاتے ہیں. اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے. کہ جیسے مجرم کو جرم کرتے ہوئے شرم نہیں آتی. اسی طرح سزا برداشت کرتے ہوئے بھی نہیں جھجکتا. بلکہ اس قسم کی سزائیں اس کے لئے تختہ مشق بن جاتی ہیں. اور عوام الناس کی نظروں میں جرم کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی. مانا کہ ان سزاؤں کو اب بھی ارباب تہذیب اور شرفاء موت سے بدتر سمجھتے ہیں. لیکن جو لوگ جرم اور سزا کے عادی ہو جاتے ہیں. ان کی نظروں میں یہ روزمرہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے. کوئی مجرم سزایاب ہونے کے بعد بنی نوع انسان کے لئے عبرت نہیں قرار پاتا. سزاؤں کے باوجود مجرم کے رشتہ داروں اہل محلہ اور اہل شہر میں اس جرم کے جذبات اور خواہشات اسی طرح باقی رہ جاتے ہیں. جیسے اس سے پہلے تھے.

جیسے حکومت برطانیہ میں چور کی سزا چھ ماہ کی قید سخت مقرر ہے. یہ ایسی سبک اور ہلکی سزا ہے. کہ سزایاب ہونے سے قبل چور کو کچھ نہ کچھ شرم و لحاظ

ہوتا بھی ہے۔ لیکن سزایاب ہونے کے بعد وہ پکا چور بن جاتا ہے۔ شرم وحیا کے پردے آنکھوں کے سامنے سے اٹھ جاتے ہیں۔ نگاہیں پھٹ جاتی ہیں۔ شرم کا پانی مرجاتا ہے۔ یہاں تک کہ سزایاب چور کی عمر اسی شغل میں گذر جاتی ہے یہی جرم اس کا پیشہ اور روزی بن جاتا ہے۔ اس کے دماغ میں یہ ذہنیت قائم ہوجاتی ہے۔ کہ جس بدنامی کا ڈر تھا وہ ہو چکی۔ اس سے زائد اور کیا ہوگی۔ اور سزا بھی وہی کچھ تھی۔ جو نباہ دی۔ اب تک ناتجربہ کار تھے۔ اس لئے کچھ تکلیف بھی محسوس ہوئی۔ اگر دوبارہ وہی سزا ملے گی تو محسوس بھی نہ ہوگی۔ یہ بھی نہ محسوس ہوگا کہ جیل خانہ میں رات گذاری یا گھر میں۔

یہی وجہ ہے۔ کہ قانونی عدالتیں کھلی ہوئی ہیں۔ پولیس اپنا کام کر رہی ہے۔ ہر ضلع میں جیل خانے موجود ہیں۔ ہر تھانہ میں حوالات موجود ہے۔ مجرموں کے خلاف رپوٹیں ہوتی ہیں۔ مقدمات دائر ہوتے ہیں۔ مجرموں کے خلاف فیصلے ہوتے ہیں۔ سزائیں ملتی ہیں۔ سب کچھ ہوتا ہے۔ پھر بھی اگر سال رواں کے سزایابوں کی تعداد و شمار کا موازنہ سال گذشتہ کے سزایابوں سے کیا جائے تو اگر سال رواں میں سابق کی بہ نسبت اضافہ نہ ہوگا۔ تو کوئی کمی بھی نہ ہوگی حالانکہ حکومت ہمہ وقت اس کے انسداد میں معروف کار رہتی ہے۔ قانون کی زنجیریں ہر وقت رعایا کو جکڑے ہوئے ہیں۔ دیہاتوں میں نئی نئی کمیٹیاں اپنا کام کر رہی ہیں۔ ہر شہر اور ہر قصبہ میں حسب حیثیت عدالتیں موجود ہیں۔ شعبۂ مالیات کے علاوہ صرف اس قسم کے مقدمات کے لئے عدالت فوجداری موجود ہے۔ قسم قسم کے منصف اور جج اور سیشن جج اپنے اپنے مقام پر کام میں مصروف ہیں۔ صوبوں کے مرکزوں میں ہائیکورٹ یا چیف کورٹ موجود ہیں۔ ان سب کے برابر نصف کام صرف پولیس کر لیتی ہے۔ جب یہ سب ناکافی ہوتے ہیں۔ تو

اسپیشل مجسٹریٹ اور آنریری مجسٹریٹ مقرر کرنا پڑتے ہیں جوری اور پنچ کے ممبران کے انتخاب کی ضرورت پڑتی ہے۔ سرحدی ممالک میں جرگہ کے ممبران کا انتخاب عمل میں لایا جاتا ہے یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ مگر جرموں کی فہرست یا حالت میں بال برابر فرق نہیں آتا، یہ کیوں صرف اس لئے کہ سزاؤں کے جو معیار مقرر کئے گئے ہیں۔ وہ ناکافی ہیں۔ کوئی سزا مجرم یا دیکھنے والوں کے لئے عبرتناک نہیں قرار پاتی۔

اس کے برخلاف اسلام نے سزاؤں کے جو معیار اور طریقے مقرر کئے ہیں ان میں ذرہ برابر رعایت سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ ہر قسم کے مجرم کے واسطے ایسی سزا مقرر کی گئی ہے۔ جو مجرم کو بھی عمر بھر یاد رہے۔ اور دیکھنے اور سننے والے بھی ایک واقعہ کے بعد کبھی اس جرم کا نام لینے یا تصور کرنے کی بھی جرأت نہ کر سکیں۔ نہ جرم کرنے کی ہمت ہو۔ اور نہ بار بار سزا کی ضرورت پڑے مثلاً چور کے لئے یہ حکم ہے۔ کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ کسی جرم کی سزا یہ ہے۔ کہ اس کا سر اڑا دیا جائے۔ کسی جرم کی سزا یہ ہے۔ کہ اسے نصف زمین میں دفن کر کے اس پر تیروں یا پتھروں کی اس قدر بارش کی جائے۔ کہ ہلاک ہو جائے۔ کسی جرم کی سزا یہ ہے۔ کہ سو کوڑے مارے جائیں۔

جس شہر میں ایک مرتبہ چور کا ہاتھ کاٹ ڈالا جائے گا۔ اس شہر میں آئندہ کون جرأت کر سکتا ہے۔ کہ وہ چوری کی طرف اقدام کرے۔ اور چور جب تک زندہ رہے گا اُسے اپنا جرم اور اس کی سزا کبھی نہیں بھول سکتی۔ بلکہ وہ تمام اہل شہر کے لئے مجسمۂ عبرت ہے۔ جب جرم اور اس کی سزا کی اس قدر اہمیت دلوں پر طاری ہو جائے گی۔ تو اس کے بعد چوری کرنے کا جذبہ ہی کبھی دل میں نہیں پیدا ہو سکتا۔ رفتہ رفتہ اس شہر میں چوری کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہ سکتا۔ اسی

طرح ہر جرم اور اُس کے سزا کی شان ہے.

غالباً یہی وجہ ہے. کہ وہ خالص اسلامی ممالک جہاں کبھی اسلام کی حکومت رہی ہے. اور وہاں اسلامی اصول کے مطابق سزائیں دی جاتی رہی ہیں. وہاں آج بھی چوری کا نام ونشان نہیں ملتا. وہاں کے باشندوں میں آج تک اس قدر امانت داری پائی جاتی ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے. وہ ایک اجنبی آدمی کا گرا ہوا یا کھویا ہوا مال اٹھاکر خود مالک کے حوالہ کر دیتے ہیں. ان کے بچے وہ کام کرتے ہیں. جو دوسرے ملکوں کے بوڑھے نہیں کر سکتے.

ہمارے ملک میں جانے بوجھے دوکاندار مشکل سے کسی کو کوئی شے قرض دیتے ہیں پھر بھی ہر وقت یہ کھٹکا رہتا ہے. کہ دیکھیں مال کی قیمت وصول ہوتی ہے یا نہیں. لیکن اسلامی ممالک میں ایک نووارد مسافر کو جو دوسرے ملک کا رہنے والا ہے. بیدھڑک قرض دیدیتے ہیں. ان کے دماغ میں یہ خطور بھی نہیں ہوتا. کہ یہ بھی ہوسکتا ہے: کہ ایک مسلمان مال لے جائے. اور اس کی قیمت ادا نہ کرے. چنانچہ ان کی اس سادگی اور صاف دلی کو دیکھ کر خریدار کو بھی شرم آجاتی ہے اور وہ سب سے پہلے اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے. یہ اثر ان اسلامی حدود اور سزاؤں کا ہے. جو صدیوں ان میں رائج رہی ہیں. ممکن ہے کہ ان سزاؤں کا استعمال کبھی کبھی غلط بھی ہوا ہو. پھر بھی کم از کم ہر شخص یہ سمجھتا ہے. کہ فلاں قسم کے جرم کی یہ سزا مقرر ہے.

اس لئے اسلام کی واحد کتاب قرآن مجید میں بڑی تاکید کی گئی ہے. کہ مجرموں کو سختی سے سزا دی جائے. اور سزا میں ذرا سی رعایت بھی نہ برتی جائے. بلکہ جس وزن کا جرم ہو ویسی ہی سزا ہو. جیسا کہ ارشاد رب العزت ہے.

ولکم فی القصاص حیٰوۃ یا ... (قصاص لینے میں تمہاری زندگی ہے)

اولی الالباب (پ۲ ع۶) (اے عقل والو)

دوسری آیت میں ارشاد فرماتا ہے۔

یاایھا الذین آمنوا کتب علیکم القصاص فی القتلی الحر بالحر والعبد بالعبد والانثیٰ بالانثیٰ۔ (پ۲ ع۶)

(اے ایمان والو! تمہارے لئے قصاص کا حکم مقرر کر دیا گیا ہے۔ آزاد کے عوض آزاد اور غلام کے عوض غلام اور عورت کے عوض عورت)

تیسری آیت میں ارشاد فرماتا ہے۔

وکتبنا علیھم فیھا ان النفس بالنفس والعین بالعین والانف بالانف والاذن بالاذن والسن بالسن والجروح قصاص (پ۶ ع۱۱)

ہم نے کتاب اللہ میں انہیں یہ حکم دیدیا ہے کہ جان کے عوض جان ہے۔ اور آنکھ کے عوض آنکھ اور ناک کے عوض ناک اور کان کے عوض کان اور دانت کے عوض دانت اور زخموں کا بھی قصاص ہے۔

چوروں کے لئے ارشاد فرماتا ہے

السارق والسارقۃ فاقطعوا ایدھما جزاء بما کسبا نکالا من اللہ واللہ عزیز حکیم۔ (پ۶ ع۱۰)

چور خواہ مرد ہو یا عورت انکے کرتوت کے عوض میں خدا کی طرف سے انکی سزا یہ ہے کہ انکا داہنا ہاتھ کاٹ ڈالو۔ اور خدا بڑا زبردست حکم والا ہے۔

فساد کرنے والوں کے بارے میں ارشاد رب العزت ہے:۔

انما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہ ویسعون فی الارض فسادا ان یقتلوا او یصلبوا

(جو لوگ خدا اور رسول سے جنگ کرتے پھرتے ہیں۔ اور فساد کرنے کی غرض سے ملکوں میں دوڑے پھرتے ہیں۔ ان کی سزا یہی

وتقطع ایدیهم وارجلهم من خلاف او ینفوا من الارض ط ذالک لهم خزی فی الدنیا. ولهم فی الاخرة عذاب عظیم (پ ۶ ع ۹)

یہی ہے۔ کہ یا چن چن کر مار ڈالے جائیں یا انہیں سولی دیدی جائے۔ یا ایک طرف کا ہاتھ اور دوسری طرف کا پیر کاٹ ڈالا جائے یا انہیں شہر بدر کردیا جائے۔ اور آخرت میں ان کیلئے بہت بڑا عذاب ہے)

الزانیة والزانی فاجلدوا کل واحد منهما مأة جلدة ص ولا تاخذکم بهما رأفة فی دین الله ان کنتم تومنون بالله والیوم الآخر ج ولیشهد عذابهما طائفة من المومنین. (پ ۱۸ ع ۷)

(زناکار عورت اور زناکار مرد دونوں کو سو سو کوڑے لگاؤ۔ اور اگر تم خدا اور قیامت پر ایمان رکھتے ہو۔ تو حکم خدا نافذ کرنے میں ان پر ترس نہ کھانا چاہیئے۔ یہ بھی ضروری ہے۔ کہ سزا دینے کے وقت مومنین کی ایک جماعت موجود ہو۔

امن کا ساتواں معیار

مظلوموں سے ہمدردی اور ظالموں سے نفرت

دنیا میں صبح و شام لاکھوں ظلم ہوتے رہتے ہیں۔ بعض ظلموں کا احساس بھی ہوتا ہے۔ دل پر چوٹ بھی لگتی ہے۔ بتقاضائے فطرت دل میں مظلوم کی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ظالم سے ایک قسم کا تنفر ہونے لگتا ہے۔ لیکن ہم اپنے ذاتی اغراض میں کچھ ایسے گرفتار ہوئے اور ہوس نفس کے کچھ ایسے شکار ہیں۔ کہ کسی اہم اور دردناک واقعہ سے متاثر ہونے کے باوجود چند ہی روز گذرنے کے بعد ہم اسے

اس طرح بھول جاتے ہیں. جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا. درحقیقت اسے ہم نہیں بھولتے بلکہ ہمارے اغراض ہماری معاشرت ہمارا طرز عمل. ہمارا ماحول ہمارے بڑوں کے طریقے ہمیں اس کے بھلا دینے پر مجبور کر دیتے ہیں. اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے دلوں میں احکام اسلام کی اس قدر وقعت نہیں. جس قدر بااثر شخصیتوں کی وقعت ہے. ہم خدا سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا دنیا کے قوت والوں اور طاقت وروں سے ڈرتے ہیں.

ہمارے دل اسے بڑا تسلیم کرتے ہیں. جسے حکومت نے بڑا بنا دیا ہو یا دولت یا علم و ہنر کی وجہ سے بڑا مان لیا گیا ہو. یا خطرناک ہونے کی وجہ سے بڑا مانا جاتا ہو.

جو لوگ کسی جائز یا ناجائز وجہ سے بڑے مان لئے جاتے ہیں. ان کی برائیاں اچھائیاں سمجھی جاتی ہیں. ان کے عیب ہنر معلوم ہوتے ہیں. وہ جتنا چاہیں ظلم کریں. کسی کو ستائیں. اذیت پہنچائیں. پریشان کریں. ناانصافی کریں. ہم اسے روا سمجھتے ہیں. اور یہ سب کچھ دیکھ بھال کے پھر بھی ان کے طرفدار رہتے ہیں کسی ظالم کا ظلم دیکھ کر ہمیں یہ خیال نہیں آتا کہ وہ ظالم ہے. بلکہ سب سے زیادہ یہ لحاظ ہوتا ہے. کہ وہ ہمارا عزیز یا رشتہ دار یا دوست یا بڑا آدمی ہے. یا ہماری ضروریات اس سے وابستہ ہیں. البتہ جن سے ہمارا واسطہ یا تعلق نہیں ہے یا وہ ایک چھوٹا آدمی اگر وہی ظلم کرتا ہے. تو ہم اس کی جان لینے کو تیار ہو جاتے ہیں. سانس لینے کی مہلت نہیں دیتے. اگر بس میں ہو. تو اس پر فوج کشی کر دیں. اس کا لباس حیات اتار لیں. جرم زید نے بذات خود کیا ہو. اور ہم اس کے عوض اس کے خاندان بھر کو پیس ڈالیں. گویا ہمارے نزدیک عزت اور ذلت کا معیار نیک چلنی اور بد چلنی نہیں. بلکہ اپنا اور غیر یا چھوٹا اور بڑا آدمی ہونا ہے

اپنا آدمی یا ایک بڑا آدمی کتنا ہی بڑا ظلم کرے۔ لیکن ہم اس کی عزت اسی طرح کرتے رہتے ہیں۔ جیسے اس سے پہلے کرتے تھے۔ ہمارا غیر یا ایک چھوٹا آدمی کتنا ہی نیک نیت اور باعمل ہو جائے۔ مگر ہم اُسے اسی طرح ذلیل سمجھتے ہیں جیسے اس سے پہلے ذلیل سمجھتے تھے۔

یہی وجہ ہے۔ کہ ظالم کو یہ محسوس ہی نہیں ہوتا۔ کہ میں نے کوئی خطا کی ہے اس لئے کہ اس کی عزت، اس کا وقار، لوگوں کی اس سے محبت اور ہمدردیاں اب بھی اسی طرح قائم ہیں۔ جیسے اس سے پہلے تھیں۔ اسی طرح مظلوم اور نیک چلن کو یہ محسوس ہی نہیں ہو سکتا۔ کہ واقعاً میں نے اچھا کام کیا ہے۔ اس لئے کہ بہتر سے بہتر عمل کرنے کے بعد بھی خدا پرستوں کی نظر میں اس کی عزت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اور نہ قابل اعتبار انسانوں کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہیں۔

یہی سبب ہے کہ مجرموں کو یہ محسوس ہی نہیں ہوتا۔ کہ وہ بُرے ہیں۔ نیک چلنوں کے دلوں میں جو عمل خیر کا جذبہ پیدا ہوا تھا۔ وہ بھی قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کہ وہ بازار انصاف میں ان جواہر کو جنہیں بیش قیمت سمجھا تھا۔ بالکل بے قیمت پاتے ہیں۔ آخرت کی جزا و سزا، تو صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اور ضرور ملے گی۔ لیکن فطرت کا تقاضا یہ ہے۔ کہ ہر انسان یہ ضرور چاہتا ہے کہ اگر وہ نیکی کرے تو اس کی نیکی کی قدر کی جائے۔ اور کم از کم اسکی نیکی کا اعتراف اور اقرار کیا جائے یا کم از کم اس کی نیکی کا بدلہ برائی یا ایذا رسانی سے نہ دیا جائے۔ وہ ضرور چاہتا ہے۔ کہ اگر ظالم کو سزا نہ دی جائے تو کم از کم اس کی عزت اور ہمت افزائی نہ کی جائے اس لئے کہ اگر خدا پرست انسان جن سے انصاف کی توقع تھی۔ ان سے بھی ایسے طرز عمل رونما ہوں تو مظلوم کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ جذبۂ عمل مجروح ہو جاتا ہے ہمت ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ عزم و استقلال متزلزل ہو جاتا ہے۔ اسلام نے عزت

اظہار ہمدردی کرنا سب سے بڑا جرم سمجھا جاتا ہے اور حضرت امام حسین علیہ السلام سے اظہار ہمدردی کرنا۔ انسانیت، عبادت اور ثواب تصور کیا جاتا ہے۔ امام حسین علیہ السلام کا مقصد بھی وہی کچھ تھا۔ جو قرآن مجید کا مقصد تھا۔ یعنی وہ کام کر جاؤں۔ کہ دنیا مظلوم سے محبت اور ظالم سے نفرت کرنے پر مجبور ہو جائے بلکہ اسی میں اپنی عزت سمجھنے لگے۔ خدا کا شکر ہے کہ آج مظلوم کا دوسرا نام حسینؑ ہے۔ اور ظالم کا دوسرا لقب یزید ہے۔ اس سے پہلے ظالمیت اور مظلومیت دو لفظیں تھیں۔ جن کے معنے سمجھنے اور مطابق کرنے کے لئے دلیل کی ضرورت ہوتی تھی۔ مگر امام حسین علیہ السلام نے ظالمیت اور مظلومیت دونو کو مجسم کر کے دکھلا دیا کہ اگر ظلم دیکھنا ہے۔ تو یزید اور یزیدیوں کو دیکھ لو۔ اور اگر مظلوم کو پہچاننا ہے تو حسینؑ اور حسینؑ والوں کو پہچان لو۔

اگر دنیا آج بھی کربلا کے پڑھائے ہوئے سبق یاد کرلے۔ ظالم سے نفرت اور مظلوم سے محبت کرنے لگے۔ ظالم سے بیزاری اور مظلوم سے ہمدردی کی خوگر ہو جائے۔ ظالم کو بے عزت اور ذلیل، اور مظلوم کو عزت دار تسلیم کرنے لگے۔ ظالموں کو یہ یقین ہو جائے۔ کہ ان کی عزت نہیں کی جائے گی۔ ان کی ہمدردی نہیں کی جائے گی۔ بلکہ انھیں ذلیل ورسوا کیا جائے گا۔ ان کو وہ سزا دی جائے گی جس کے وہ حقدار ہیں۔ ان کی شخصیت کسی با انصاف دل کو مرعوب نہ کرسکے گی۔ اور مظلوم یہ سمجھ لیں۔ کہ کم از کم خدا پرستوں کی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں۔ ان کی دادرسی ضرور کی جائے گی۔ ان کی عزت اسی میں ہے۔ کہ وہ مظلوم ہیں۔ ان کے دشمن سے انتقام لیا جائے گا۔ اگر یہ دونوں شرائط ملحوظ نظر رہیں۔ تو تمام عالم میں امن وامان قائم ہو سکتا ہے۔

(آٹھواں۸ نواں۹ دسواں۱۰ گیارھواں۱۱ اور بارھواں۱۲ معیار)

اگرچہ ان معیاروں کے علاوہ اور بہت سے ایسے معیار ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے اور ان میں سے ہر ایک قیام امن کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ مثلاً

(۸) کسی تحریر یا روایت اور خبر کو صرف پڑھ کر یا سن کر فوراً اس پر اعتبار کر کے مشتعل نہ ہو جانا بلکہ اولاً اسکی تحقیق کرنا اس کے بعد ٹھنڈے دل کے ساتھ اس پر غور کر کے اس پر اپنی رائے قائم کرنے کے بعد کوئی مناسب اقدام کرنا۔ فوراً کسی سے بدظن نہ ہو جانا۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے

ان جاءکم فاسق بنباء فتبینوا (پ ۲۶ ع ۱۴) — اگر فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو پہلے اس کی تحقیق کر لیا کرو۔

(۹) تم ہر قیمت پر سچائی پر جمے رہو اور سچ کا ساتھ دو چاہے اس کیلئے تمہیں عظیم ترین قربانی دے کر سر دھڑ کی بازی کیوں نہ لگا دینا پڑے۔ جیسا کہ ارشاد فرماتا ہے۔

یاایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصادقین۔ — اے ایمان والو خدا سے ڈرو اور سچوں کا ساتھ دو۔

ھذا یوم ینفع الصادقین صدقھم — قیامت کا دن وہ دن ہے۔ جب سچوں کی سچائی کام آئے گی۔

(۱۰) بیجا تعصب یا جنبہ داری سے احتیاط و اجتناب کرنا۔ معاملات کے تصفیہ میں قومی یا مذہبی یا خاندانی خصوصیات کے تصورات سے بالاتر رہ کر وسعت نظر اور فراخ دلی سے ہر پیش آمدہ معاملہ پر غور کرنا اور اس کا تصفیہ کرنا۔ اگرچہ اپنے خلاف ہی فیصلہ کیوں نہ کرنا پڑے۔ یہ ضبط و تحمل اور اعتدال پسندی جس دل و دماغ میں ہو وہ صحیح مسلمان کہنے کے قابل ہے۔ ملاحظہ ہو ارشاد الٰہی۔

واذا حکمتم بین الناس — جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو

ان تحکموا بالعدل. — صرف عدل وانصاف پر نظر رہے۔

ولا یجرمنکم شنان قوم علی ان لا تعدلوا (پ ۶) — حد یہ کہ اگر اس جرأت عدل پر تمہیں لوگ برا کہیں تو اسکی بھی پرواہ نہ ہونا چاہیئے۔

فان فاءت فاصلحوا بینھما بالعدل واقسطوا. — اگر وہ رجوع کرلیں تو ان دونوں کے درمیان انصاف سے فیصلہ کردو۔ اور عدل کا لحاظ رکھو

(۱۱) جبر وتشدد سے دین وملت کی تبلیغ حقیقت اسلام کے منافی ہے۔ جے دین اسلام قبول کرنے پر مجبور کردیا جائے وہ حقیقت میں مسلمان نہیں ہوا۔ ملک گیری اور چیز ہے۔ اور اسلام اور چیز ہے۔ اسلام تلوار سے نہیں اخلاق سے پھیلانا چاہیئے۔ اس لئے اعلان فرمادیا گیا ہے۔

لا اکراہ فی الدین — دین میں زبردستی نہیں ہے۔

(۱۲) کسی قوم ومذہب کو مشتعل کرنے اور دلوں پر چوٹ لگانے والی تقریروں تحریروں اور باتوں سے اجتناب کرکے حکمت اور نرمی۔ اخلاق ومحبت کے ساتھ اسلام کے حسین اور مستحکم نظریات دوسروں کے دل ودماغ میں اپنے قول وعمل سے اس طرح بٹھانا کہ وہ دشمن کے دل ودماغ میں بھی جگہ حاصل کرلیں۔

ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ. — حکمت اور حسین وخوشنما نصیحت سے خدا کے راستہ کی طرف دعوت دو۔

اسی لئے یہ حکم دیا گیا ہے کہ کافروں کے خانہ ساز خداؤں پر سب دشتم نہ کرو ورنہ وہ تمہارے حقیقی خدا پر سب وشتم کریں گے۔

یہ بھی ایسے معیار ہیں۔ جن پر امن عالم کا دارومدار ہے۔ لیکن اگر نظر غائر سے دیکھا جائے۔ تو اندازہ ہوجائے گا۔ کہ یہ سب ایسے جزئیات ہیں جو مذکورہ بالا

کلیات میں داخل یا انہیں معیاری اصول کے فروع ہیں۔ اس لئے صرف اہم ترین معیاروں پر اکتفاد کی گئی ہے اور باقی کو طالبان حق کی تلاش اور انصاف پر چھوڑا جاتا ہے۔ اس لیئے کہ انسانیت کی اصلاح و ترقی اور تمدن صرف تین حالتوں پر موقوف ہے۔ پہلے[1] تہذیب الاخلاق۔ یعنے اپنے نفس اور اپنے اعمال کی اصلاح دوسرے[2] تدبیر منزل یعنے گھر والوں سے برتاؤ کے طریقے۔ تیسرے[3] سیاست مدن یعنے شہر یا ملک والوں سے حسب حیثیت و حسب ضرورت و حالت مناسب برتاؤ۔

یعنی انسان کو کیا کرنا چاہیئے۔ شوہر کا زوجہ سے کیا برتاؤ ہونا چاہیئے۔ اور زوجہ کا شوہر سے کیا برتاؤ ہونا چاہیئے۔ اولاد کے ماں باپ پر کیا حقوق ہیں۔ اور ماں باپ کے اولاد پر کیا حقوق اور اختیارات ہیں۔ بزرگان خاندان پر کیا ذمہ داریاں ہیں۔ اور خوردوں کے کیا فرائض ہیں۔ چھوٹے اور بڑے بھائیوں اور بہنوں اور ان کے بچوں کے باہم کیا برتاؤ ہونا چاہیئے نیکوں سے کیا برتاؤ ہونا چاہیئے۔ اور بروں سے کیا سلوک کیا جائے۔ استاد کے کیا حقوق ہیں اور شاگرد کی کیا کیا ذمہ داریاں ہیں۔ اہل محلہ سے کیا برتاؤ ہونا چاہیئے۔ اہل شہر یا ملک والوں سے کیا برتاؤ ہونا چاہیئے۔ دولت مندوں کے فرائض کیا ہیں۔ مساکین کی ذمہ داریاں کس قدر ہیں۔ دوستوں سے کیا برتاؤ کرنا چاہیئے۔ دشمنوں سے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ بادشاہ کے کیا فرائض ہیں۔ رعایا کے کیا حقوق ہیں علماء کے حقوق اور ذمہ داریاں کیا اور کس قدر ہیں۔ عوام الناس کے کیا فرائض ہیں۔ چھوٹوں اور بڑوں سے تعلقات کا معیار کیا ہے۔

یہ وہ اصول اور قوانین ہیں جن میں سے ہر قانون کے متعلق شریعت اسلام نے اس شرح و بسط کے ساتھ اسلام کے نظریہ کو واضح کر دیا ہے کہ جس کے مطالعہ کے بعد ایک نا سمجھ اور بلید انسان بھی ناواقف نہیں رہ سکتا۔ علم فقہ، اور

علم اخلاق، اور سیرت معصومین علیہم السلام کے موضوعوں پر ہزاروں کتابیں ہر زبان میں موجود ہیں۔ اور مسلمانوں کا کوئی گھر نہیں۔ جہاں ایک دو نسخے دستیاب نہ ہو سکیں۔ خاص کر فقہ کی کتابوں میں اس کے فاضل مصنفین نے عبادات[۱] (مثلاً نماز۔ روزہ وغیرہ) معاملات[۲] وعقود (مثلاً تجارت ونکاح ورہن وغیرہ) ایقاعات[۳] (مثلاً طلاق وغیرہ) حدود[۴] (مثلاً تعزیرات وغیرہ) فرائض[۵] (مثلاً میراث وغیرہ)

اس قسم کی چند سرخیوں کے دامن میں ہر انسان کے ذاتی اور معاشرتی اور تمدنی جملہ ضروریات کو جمع کر دیا ہے۔ کتب اخلاق وسیر نے ان قوانین کے عملی نمونے پیش کر کے ہر قانون کو ذہن نشین کرا دیا ہے۔ اگر ان قوانین کو مجموعی صورت میں دیکھا جائے۔ تو ان کا اعلیٰ ترین مقصد دنیا میں صلح اور امن قائم کرنا ہے۔

کوئی شبہ نہیں۔ کہ اگر آج ان قوانین کی مکمل پابندی کی جائے۔ تو دنیا میں بدامنی اور فساد کا نام ونشان نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا یہ کہنا حق بجانب ہے۔ کہ اسلام مجسّم امن وامان کا نام ہے۔ اس لئے جو مسلمان صلح جو رہے اسے مسلم کہا جا سکتا ہے۔ اور جو امن کا حامی ہو۔ وہ مومن کے خطاب سے یاد کیا جا سکتا ہے جسے صلح اور امن سے تعلق نہ ہو اس کا نہ اسلام سے دور کا تعلق ہو سکتا ہے اور نہ ایمان سے۔

وما علینا الا البلاغ ۵

ہمیشہ کارآمد مرد مومن کے گھر کی زینت جامع ترین بہترین تحفہ

حیدری کیلنڈر

مولفہ

علامہ میرزا یوسف حسین لکھنوی سرپرست خصوصی امامیہ مشن پاکستان

جس میں حضرات چہاردہ معصومین علیہم السلام کی ولادت و وفات، نسب و عمر، وجہ شہادت و مدفن، اور اولادِ ذکور و اناث اور اصحاب خاص سلاطین اسلام کے دورِ حکومت کا خلاصہ، اسلام کے اہم واقعات، غزوات اسلام کی مکمل فہرست، رویت ہلال مع ادعیہ، شکیات و سہویات نماز۔ اختیارات ایام ہفتہ، مہینہ بھر کی تاریخوں کا حال مع تعبیر خواب، ہر ماہ کی تاریخوں کے سعد و نحس اور ان کے اہم خصوصیات کو نہایت خوشنما صورت میں جمع کر کے اعلیٰ کاغذ پر ۳ رنگوں میں طبع کیا گیا ہے ان تمام خوبیوں کے باوجود قیمت صرف ایک روپیہ۔ آرڈر جلد دیں ورنہ طبع ثانی کا انتظار کرنا ہوگا۔